انتظار حسین

آگہی

مرتبہ

کچھ وے

پچھوے

انتظار حسین

مطبوعات ۔ لاہور

جملہ حقوق بحق مصنف محفوظ

مصنف انتظار حسین

ناشرین خالد احمد، نجیب احمد

مکتبہ مطبوعات، ۶۔اے نسبت روڈ، لاہور

مطبع شرکت پرنٹنگ پریس۔ لاہور

بار اوّل ۱۹۸۱ء

تعداد ایک ہزار

قیمت ۲۵ روپے

سرورق : مُوحد

انتساب

پھر نارد نے پوچھا: "اچھا، روشنی سے بھی بڑھ کر کوئی چیز ہے؟"
"ہاں ہے"، سنت کمار نے کہا۔ "ہوا روشنی سے بڑھ کر ہے کہ آدمی ہوا میں پیدا ہوا، ہوا ہی میں پلا بڑھا، ہوا ہی میں جیتا ہے۔ ہوا ہی کے کارن ہم بولتے ہیں، سنتے ہیں۔"

"اچھا! ہوا سے بھی بڑھ کر کوئی چیز ہے؟"

"ہاں ہے۔ یاد ہوا سے بڑھ کر ہے کہ آدمی سے اس کی یاد چھین لو۔ پھر نہ وہ سنے گا، نہ سوچے گا، نہ سمجھے گا۔ اس کی یاد اسے لوٹا دو، سنے گا، سوچے گا، سمجھے گا۔"

فہرست

قدامت پسند لڑکی ——— ۹

۳۱ مارچ ——— ۱۹

فراموش ——— ۲۳

بادل ——— ۴۱

اسیر ——— ۴۶

ہندوستان سے ایک خط ——— ۵۵

نیند ——— ۶۷

کچھوئے ——— ۷۳

پتے ——— ۹۳

واپس ——— ۱۰۶

رات ——— ۱۱۲

دیوار ——— ۱۲۰

خواب اور تقدیر ——— ۱۲۷

شور ——— ۱۴۱

صبح کے خوش نصیب ——— ۱۴۴

بے سبب ——— ۱۵۰

کشتی ——— ۱۵۴

نئے افسانہ نگار کے نام ——— ۱۶۷

قدامت پسند لڑکی

وہ چست قمیض پہنتی تھی اور اپنے آپ کو قدامت پسند بتاتی تھی۔ کرکٹ کھیلتے کھیلتے اذان کی آواز کان میں پہنچ جاتی تو دوڑتے دوڑتے رک جاتی، سر پہ آنچل ڈال لیتی اور اس وقت تک باؤلنگ نہیں کرتی جب تک اذان ختم نہ ہو جاتی۔

یہ اس لڑکی کا ذکر ہے جو مہاتما بدھ کی پیروتھی اور تیسوں روزے رکھتی تھی۔ لٹریچر کا پروگرام ہو یا کرکٹ کا میچ، روزہ اس کا کبھی قضا نہیں ہوا۔ گولے کی آواز پر وہ پرس سے الائچی نکالتی، روزہ افطار کرتی اور پھر مصروف ہو جاتی۔ اور انٹر کالجیٹ تقریری مقابلے میں ایک مرتبہ وہ صرف اس وجہ سے ہار گئی تھی کہ جب اس کی باری آئی تو مغرب کی نماز کا وقت ہو چکا تھا۔ اور وہ نماز قضا نہیں کر سکتی تھی۔

مگر وہ فرقہ پرست نہیں تھی۔ وہ مہاتما بدھ کی پیرو تھی اور انسان دوستی اس کا مسلک تھا؛ یہ الگ بات ہے کہ اس نے محسن کو جو سوئٹر اپنے ہاتھ سے بن کر دیا تھا اس کا مطلب محسن نے انسان دوستی کے سوا کچھ جانا۔ یہ سوئٹر پہن کر اس نے جذبے کی گرمی محسوس کی اور ایک قدم آگے

بڑھا دیا، مگر اسے فوراً ہی پیچھے ہٹنا پڑا۔ محسن نے معذرت کی اور ساجدہ نیاز نے جواب دیا:

"میں مہاتما بدھ کی پیرو ہوں اور معاف کر دیا کرتی ہوں۔"

اس جواب سے محسن کو بہت ڈھارس ہوئی۔ وہ خود بھی تو تلوار سے اسلام پھیلانے کا قایل نہیں تھا۔ اس نے امن و آشتی کی فضا میں اپنے جذبے کی خاموش تبلیغ کا تصور کیا اور مطمئن ہو گیا۔ جذبے کی خاموش پُرامن تبلیغ سے اس نے چند دنوں میں زمین کو ہموار پایا اور تجویز پیش کی کہ "چلو پکچر دیکھیں۔"

اس نے اسے غور سے دیکھا اور سنجیدگی سے بولی: "دیکھیے میں بہت قدامت پسند ہوں۔"

محسن کو ایک دفعہ پھر معذرت کرنی پڑی۔ اور چونکہ وہ مہاتما بدھ کی پیرو تھی، اس نے اسے معاف کر دیا۔

چند دنوں میں اس نے کھویا ہوا اعتماد پھر پا لیا۔ اور ایک روز جب وہ ملے تو موسم بہت خوش گوار تھا۔ اس نے موسم کو اشارۂ غیبی جانا اور تجویز پیش کی کہ "دریا پر چلیں۔"

وہ پھر سنجیدہ ہو گئی اور بولی: "دیکھیے میں بہت قدامت پسند ہوں اور مردوں کے ساتھ بوٹنگ نہیں کیا کرتی۔"

محسن نے جب یہ مذاق اشرف کے سامنے پیش کیا تو وہ بہت ہنسا: "لڑکی اور قدامت پسند۔"

"ہاں یار وہ بہت قدامت پسند ہے۔"

اشرف ہنستے ہنستے رکا اور سنجیدگی سے کہا: "احمق، لڑکی کبھی قدامت پسند نہیں ہوتی۔"

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ ہے کہ لڑکی تاریخ میں کبھی قدامت پسند نہیں ہوئی قدامت پسند صرف دو چیزیں ہوتی ہیں: بوڑھی عورت اور نوخیز لڑکا۔ تیسری کوئی مخلوق قدامت پسند نہیں ہوتی۔"

محسن نے اشرف کے نقطۂ نظر سے اتفاق نہیں کیا۔ اشرف کا ان معاملات میں نقطۂ نظر اتنا مختلف تھا کہ محسن کو اس سے کبھی اتفاق نہ ہو سکا۔ اشرف رومانٹک ہونے کے سخت خلاف تھا

یہاں تک کہ جب صفیہ نے نیند کی گولیاں کھا کر خودکشی کا تہیہ کیا اس وقت بھی وہ رومانٹک نہیں ہوا۔ اور صفیہ نے آنکھوں میں آنسو بھر کر کہا: "میں نے تو نیند کی گولیاں کھائیں اور بچ گئی مگر تم ایک دن شاہی مسجد کے مینار سے کود کر خودکشی کرو گے۔"

اشرف نے نہایت سادگی سے جواب دیا: "نہیں۔ میں شاہی مسجد کے مینار پر چڑھا ہوں خودکشی کے لیے وہ نہایت نامناسب مقام ہے۔"

مگر ایسا بھی نہیں کہ اشرف کو خودکشی کا خیال کبھی آیا ہی نہ ہو۔ عطیہ کی خاطر وہ خودکشی کرنے کے لیے سچ مچ تیار ہو گیا تھا۔ کئی دن وہ اس خیال سے باؤلا بنا پھرتا رہا۔ مگر وہ بے سوچے سمجھے قدم اٹھانے کا قائل نہیں تھا۔ اس کے متانت سے اپنے اس جذبے پر غور کیا اور پھر اس کا ذکر سید حسن سے کیا۔ سید حسن نہایت ثقہ اور سمجھدار آدمی تھے اور آزادی اظہار کے سخت حامی۔ انھیں یہ بات معلوم تھی کہ خودکشی بھی اظہار ذات کی ایک صورت ہے۔ پس انھوں نے اس میں براہ راست مخل ہونا اپنے اصول کے خلاف جانا، البتہ اتنا کہا: "ڈاکٹر اصغر سے مشورہ کیا؟"

"نہیں۔"

"کر لو۔"

یہ بات اشرف کے دل کو بہت لگی۔ وہ فوراً ڈاکٹر اصغر کے پاس گیا۔ جب وہ وہاں سے واپس آیا اس کا ارادہ بدل چکا تھا۔ "بات یہ ہے،" اس نے نہایت متانت سے کہا، "میں نے اپنی الجھن کو سمجھ لیا ہے۔ میں اصل میں اڈیپس کمپلیکس کا شکار ہوں۔ میری والدہ مرحومہ کا رنگ سانولا تھا اور عطیہ کی رنگت بھی سانولی ہے۔"

یوں اس کے بعد بھی اشرف سانولی لڑکیوں کے پیچھے دیوانہ ہوتا رہا۔ مگر اس نفسیاتی بصیرت کے ساتھ کہ وہ اڈیپس کمپلیکس کا شکار ہے۔ اور اس لیے خودکشی کے خیال نے اسے پھر کبھی نہیں گھیرا۔

سید حسن کسی کمپلیکس کا شکار نہیں تھے۔ ان میں ثقافت اور دانش وری اس درجہ فراواں تھی کہ وہ کسی کمپلیکس میں مبتلا ہو ہی نہیں سکتے تھے۔ البتہ وہ لندن کے ناسٹلجیا میں مبتلا تھے۔ شام

کو وہ روز برٹش کونسل محض اس وجہ سے جاتے تھے کہ وہ گوشہ انہیں لندن کا گوشہ لگتا تھا۔ لاہور سے بیزار تھے۔ کہتے تھے کہ "یہاں آکر دنیا سے کٹ گیا ہوں۔ لندن کے اخبار یہاں ہفتہ بھر بعد پہنچتے ہیں۔" وہ جب لیڈرز پروگرام میں امریکہ گئے تھے تو وہاں سے صرف ایک ریفریجریٹر اور ایک بدھ کی مورتی لائے تھے۔ کار انہوں نے بہت بعد میں خریدی تھی۔ اور پھر کار ہونے کے باوجود وہ ہفتے میں ایک دن بس میں سفر لازماً کرتے تھے تاکہ عوام سے ان کا رابطہ قائم رہے اور وہ طبقاتی علیحدگی پسندی کا شکار نہ ہو جائیں۔ وہ کھدر کا کرتا پہنتے تھے اور شہر کے اونچے ہوٹل شیزان میں بیٹھتے تھے۔ اور اپنے انگریزی پھولوں کی کیاری میں انہوں نے ایک کی قلم بھی لگائی تھی تاکہ دیسی کلچر فراموش نہ ہو جائے۔ صادقہ زین العابدین نے ان پھولوں کے بارے میں یہ سوال اٹھایا کہ "ان میں مہک تو ہے ہی نہیں۔" مگر جب سید حسن نے اسے یہ سمجھایا کہ "خوشبو اور مہک کا مطالبہ خام جمالیاتی مذاق کا مطالبہ ہے" تو وہ اپنے اعتراض پر خود ہی شرمندہ ہو گئی۔ پھر اس نے خوشبودار دیسی پھولوں کو بھول کر سید حسن کے انگریزی پھولوں کو اس طرح پسند کرنا شروع کیا جیسے نئے نئے تہذیب یافتہ ہلکے پھلکے گانوں سے ترکِ تعلق کر کے کلاسیکی موسیقی سے عشق کرتے ہیں۔

صادقہ زین العابدین نے آدرے ہیپرن کی طرز پر اپنی زلفیں ترشوائی تھیں۔ عاشورہ کے دن وہ ان زلفوں میں کنگھی نہیں کرتی تھی اور کالا لباس پہنتی تھی۔ کالے لباس پر دوستوں نے انگلیاں اٹھائیں تو سید حسن رقیق القلب ہو گئے اور بولے: "محرم میں کالی قمیض پہننا مذہب نہیں ہے کلچر ہے۔"

اس پر سب چپ ہو گئے کیونکہ کلچر کے تو سب ہی قایل تھے۔ اور جب سید حسن نے اپنے گھر مجلس منعقد کی تو اس میں سب شریک ہوئے۔ صادقہ زین العابدین نے اس روز نہ بالوں میں تیل ڈالا تھا نہ کنگھی کی تھی اور ملگجی سیاہ قمیض کے پہلو والے پٹچ بٹن سب کھلے ہوئے تھے۔ سید حسن کا دل اس دن یوں بھی گداز ہو جاتا ہے۔ یہ دیکھ کر وہ اور بھی بے چین رہے۔ اور اس نے سید حسن کے گھر پہنچ کر مہاتما بدھ کی مورتی پر اپنا رومال ڈال دیا اور دیوار میں آویزاں نیوڈ

کو اُلٹ کر دیا۔ پھر اس نے نجم الحسن کی بنائی ہوئی تجہیز کی تصویر ذوالجناح کو کارنس پر سجایا اور
پھر کی خصوصیت کے ساتھ اگربتیاں سلگائیں۔ یہ حسن نے اپنی انگریزی چھوڑ کی کیا سر کی سے
پھنوں اکبر اور گوہر تھا اور نجم الحسن کی پینٹنگ پر ڈال دیا۔ پھر صادقہ زین العابدین کا بازو پکڑ کر
رونے لگی۔ سید حسن رو پڑ کر رو دیئے اور بولے کہ "ذوالجناح اور علم صلیب سے بڑے سمبل ہیں۔
تم نہیں جانتے ہمارے پیغمبر ان سے کیوں متاثر نہیں ہوتے؟" شرف نے کہا کہ پچھلے ایک سال سے
متعلق مسلمانوں کی تنظیم ہامشی تھا۔ یہ سنا اور متاثر ہو اور تعزیتی آثار کو رکھ کر۔ سر سے عاجز آیا
تھا کہ اگلے برس دیکھیں کالی تعزیتی پہنے گا۔ مگر چونکہ چند ہی ماہ بعد ماریشس میں ایک نئی تنظیم
بنی اور شرف کو یونیک سے چند دن چند خدمات ہو گئے اس لئے یہ ارادہ پورا نہ ہو سکا۔ مگر حسن
کے لئے یہ ایک مقدس شی تھا اس کے وجود سے انکار تو ان سے میٹرک میں فرسٹ ڈویژن لینے
کے بعد ہی ایک مقدس شی تھا اور اب تو یہ دیکھ لیا کہ ایک سوشل ہومنٹ کے طور پر
[illegible] اس پروگرام کو سوسائٹی کے دشمنوں سے بچانے کے لئے [illegible]
[illegible] تھا۔ البتہ خود [illegible] کا [illegible] نہیں [illegible]
[illegible] کی [illegible] اسے [illegible] نہیں [illegible]

[illegible] کیا [illegible] کی [illegible] نہیں [illegible]
[illegible] کی [illegible] کی [illegible]
[illegible] کی [illegible] کی [illegible]
[illegible] کی [illegible] کی

نے نہایت متانت سے اپنا ہاتھ کھینچ لیا۔

ساجدہ نیاز محسن ہی کو نہیں اپنی بہن زاہدہ کو بھی غیر سنجیدہ جانتی تھی، اور زاہدہ واقعی غیر سنجیدہ تھی۔ اس کے کمرے میں بغیر دستک دیے گھس آتی اور اگر وہ سوتی ہوتی تو لحاف اٹھا کر اُلٹا پھینک دیتی۔ اسی ہڑدنگے پن میں تو وہ اعلیٰ التعلیم سے محروم رہ گئی تھی۔ گھر کے کمروں سے لے کر عقب کے باغیچے تک قلانچیں لگاتی پھرتی تھی۔ جب افو گرمیوں کی چھٹیاں خالہ کے گھر گزارنے آیا تو ساجدہ نیاز نے تو اسے مطلق منہ نہیں لگایا۔ منہ کیا لگاتی، فرسٹ ایر کا تو وہ طالب علم تھا۔ مگر زاہدہ ایک دن کے اندر اندر اس سے گھل مل گئی۔ خیر پہلا دن تو کچی امبیاں توڑنے ہی میں گزر گیا اور دونوں اس میں ایسے غرق ہوئے کہ انھیں ایک دوسرے کے وجود کا احساس تک نہیں ہوا۔ دوسرے دن جب انھیں ایک دوسرے کے وجود کا احساس ہوا تو وہ بھی عجیب طرح سے۔ نہ انھوں نے رومانٹک باتیں کی تھیں، نہ ایک دوسرے کا ہاتھ تھاما تھا، نہ آنکھ میں مرگیاری تھی۔ ہوا یوں کہ جب وہ امبیاں توڑ کر درخت سے زاہدہ کا سہارا لے کر نیچے رہا تھا تو اس کا سانس تیز اور گرم ہو گیا۔ اور گرمی اس وقت بہت تھی۔ اس تپتی دوپہری میں درختوں کے درمیان گھومتے گھومتے ان کے جسم تپنے لگے تھے۔ زاہدہ کے گورے گال گرم ہو کر سرخ ہو گئے تھے اور قمیص پسینے میں بھیگ کر بے بنیان والی بھری پشت پر چپکنے لگی تھی۔ قمیص کے شانوں کے سہارے درخت سے نیچے اترتے اترتے افو کا سانس تیز ہو گیا اور نیچے اس کی گود میں گر پڑی۔ اور جیسے گرم دوپہر میں پانی چمکتے چمکتے یکایک مرنے لگتا ہے اور مرتے مرتے چمکنے لگتا ہے اور پھر دونوں گتھم گتھا ہو جاتے ہیں، اسی طرح ان دونوں پر ایک ایسی کیفیت طاری ہو گئی۔

جب زاہدہ پلٹ گئی تو انھوں نے اپنے آپ کو بہت ہلکا اور بہت پاکیزہ محسوس کیا۔ بس انھیں یہ لگا کہ کچی امبیاں کھاتے کھاتے انھوں نے کوئی بیٹھا رس بھرا آم چوس لیا ہے [illegible] ریلیز ہو کر چڑیوں کے موسم سرد سے گونجتا

کر چھری کی سیدھی پیٹھ میں دو ٹکڑے سلیقے سے اس کی دو بھیانک بیں تراشتی ، بچھا کموں کو قتلہ قتلہ کرتی
و ایک متانت آمیز بے تعلقی کے ساتھ انہیں کانٹے سے تناول کرتی ۔ مذہبی عقیدے سے
لے کر سرد سے کی تاش تک ہر شے پر یہ متانت آمیز بے تعلقی برقرار رکھی تھی ۔ مگر محسن اور اس
کے درمیان پھر بھی لڑائی ہو کر رہی ۔ ہوا یوں کہ ابھوس پر لیسے کا مسئلہ درمیان میں آگیا ۔ محسن
نے VULGER کہنا تھا ۔ بات بڑھ گئی اور صاحبہ شبانہ نے اعلان کیا کہ "میرے اور آپ
کے درمیان نظریات کا فرق پیدا ہو چکا ہے "

محسن نے جب یہ متوقع اطلاع شرف کو دی تو اس نے اسے جھڑک دیا ! "فضول باتیں
مت کرو ۔ عورت اور مرد کے درمیان نظریات کا فرق کبھی پیدا نہیں ہوتا ۔"

"مگر وہ ہو گیا ہے !"

"ہو گیا ہے تو یا تم مرد نہیں ہو یا وہ عورت نہیں ہے ۔"

شرف کا نظریہ یہ تھا کہ نظریات آدمی کی حماقت ہیں ۔ عورت کے نظریات نہیں ہوتے
[illegible] ہیں ۔ مگر صاحبہ شبانہ کو یہ احساس تھا کہ وہ نظریات رکھتی ہے ۔ اس کے اسی احساس
نے محسن کے لیے جدائی کی اذیت کا سامان کیا ۔ محرومی کے عالم میں محسن نے کچھ نہیں سوچا ۔ بس
وہ خود کو [illegible] وہ پہاڑ سے پھاند کر جنگل میں نکل جائے اور سادھو بن جائے ۔

[illegible] نے ان میں سے کسی تجویز پر عمل نہیں کیا ۔ ان کا خیال تھا کہ یہ سب [illegible]
[illegible] "اور عشق" [illegible] نے [illegible] کرنی [illegible] حالت نہیں
[illegible] "[illegible] گئے [illegible] ان سے [illegible] تعلق پر [illegible]
ہے ؟" محسن نے جب کہ سوال کیا ۔

[illegible]

وہ ستارے گن بیٹھ گئی تھی۔ جب اذان ہوئی تو اس نے وضو کر کے فریضۂ سحری ادا کیا۔ پھر تلاوت کرنے بیٹھ گئی۔ صبح ہوئے پر اس نے قرآن جزدان میں بند کیا، ریڈیو آن کیا اور جالندھر سے بھجن سننے لگی۔ اتنے میں محسن کا ٹیلی فون آگیا۔ اس نے نہایت بے تعلقی سے محسن کی بات سنی اور پھر بڑی شائستگی سے جواب دیا:

"محسن صاحب، معاف کیجیے میرے اور آپ کے درمیان نظریات کا فرق ہے۔ میں اپنے آپ کو آپ سے بہت دور محسوس کرتی ہوں اس لیے آنے سے معذور رہوں گی۔ شکریہ۔" وہ ٹیلی فون بند کر کے جب برآمدے میں آئی تو سامنے باغیچے میں زاہدہ دوپٹے سے بے نیاز شلوار کے پائنچے چڑھائے امرود کے پیڑ پر چڑھ رہی تھی۔ افو نے اس کی دونوں ٹانگیں پکڑی ہوئی تھیں اور اسے اوپر چڑھنے میں سہارا دے رہا تھا۔ زاہدہ نے ایک کچا امرود توڑ کر آدھا کھایا اور آدھا پٹ کر افو کے سر پر کھینچ مارا۔ افو نے چلچلا کر اس کی ننگی پنڈلی میں کاٹ لیا۔ وزیر صاحب نیاز کو اس بیہودگی پر بہت غصہ آیا۔ وہ واپس اپنے کمرے میں چلی گئی۔ کچھ دیر بے خیال سی بیٹھی رہی۔ سمجھ میں نہ آیا کہ وقت کا صیاد کیسے کاٹا جائے۔ آخر اس نے پھر ستار اٹھا لیا اور رات کے وقت تک مشق جاری رکھنے کی ٹھانی۔

محسن سے جھگڑے کا جو صدمہ اس ٹیلی فون کے بعد بھی نہیں ہوا۔ اس نے اب اپنے عشق کو ایک تربیتی کورس تصور کر لیا تھا اور اپنے تجربے کو ایک تخلیقی تجربہ سمجھ کر تسلیم کیا تھا۔ مگر پھر اس کے ذہن پر سایہ سا پڑا۔ یہ سایہ اسے بے طرح یاد آئی اور پھر اسے یوں لگا کہ اس کا عشق تعمیری طاقت بننے کی بجائے ایک تخریب ہے اور وہ بیمار قسم کی داخلیت پسندی کا شکار ہو رہی ہے۔

اشرف نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالیں اور سیدھا سوال کیا۔

"تم نے اسے ....."

مگر محسن اس سوال پر اتنا سٹپٹایا کہ اشرف کا فقرہ پورا نہیں ہونے دیا اور جواب دیا:

"نہیں۔ نہیں۔"

"کیوں؟"

"بس نہیں۔"

"احمق!" اشرف نے تحقیر آمیز لہجے میں کہا، "وہ محض تمہاری پیروی سے معاف کر دیتی مسائل پیدا کرنے پر دھونے کا عذاب اس کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔"

محسن نے دکھ بھری نظروں سے اسے دیکھا اور چپ رہا۔ پھر وہ سوچ میں ڈوب گیا۔ پھر اس نے ٹھنڈا سانس بھرا اور بولا: "خیر اب تو وہ گئی۔"

"گئی؟ کون گئی؟ تو نرا گاؤدی ہے۔ وہ چیزیں آ کر نہیں جایا کرتیں، بڑھاپا اور عورت۔"

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ ہے کہ پھر آئے گی۔"

محسن نے مایوسانہ کندھے جھکائے اور چپ ہو گیا۔

"میں صحیح کہتا ہوں۔" اشرف نے پھر کہا، "تاریخ اور عورت، یہ دو حقائق ہمیشہ اپنے آپ کو دہراتی ہیں۔ جو عورت آ گئی ہے وہ نہیں جائے گی۔ مگر آنے والی ایک مرتبہ ضرور جاتی ہے اور سوچنے کی مہلت دیتی ہے اور جانے والی ایک مرتبہ اور بدک کر پلٹتی ہے۔ طے بات ہے کہ وہ پھر آئے گی۔"

اور اس کے بعد اشرف روز ملنے پر اس سے پہلا سوال یہ کرتا: "آئی؟"

"نہیں۔"

"انتظار کرو، آئے گی۔"

"ایک روز محسن نے طنز دی مگر رنجیدہ ہوئی آواز میں: "یار وہ آئی تھی۔"

"دیکھو، میں نہ کہتا تھا۔ مان واب ہمیں استاد۔"

مگر محسن نے اشرف کے اس انتظار کو کوئی اہمیت نہیں دی۔ رک کر بولا: "یہ سوئٹر جو میں پہنے ہوئے ہوں، یہ مجھے اسی نے پرزنٹ دیا تھا۔"

"پھر؟" اشرف نے بھونچکا ہو کر پوچھا۔

"پھر یہ کہ ساجدہ آئی۔ اس نے کہا: "ہم آپ نفسیاتی طور پر الگ ہو چکے ہیں، کہ ہمارا سوئٹر ہمیں واپس دے دیجئے۔"

"اچھا؟" اشرف حیران رہ گیا، "پھر؟"

محسن، کہ عشق سے زندہ رہنے کے آداب سیکھ رہا تھا، بولا: "پھر کیا، معاملہ تو ختم ہو گیا۔ مگر تم جانتے ہو کہ یہ دسمبر کا مہینہ ہے، جنوری کا مہینہ پورا پڑا ہے۔ میں نے صاف کہہ دیا۔ کہ سردیوں سردیوں میں یہ سوئٹر واپس کرنے سے معذور رہوں گا۔"

"معقول بات ہے۔ کیا کہا اس نے؟"

"کیا کہتی؟ وہ مہاتما بدھ کی پیرو ہے، پھر اس نے معاف کر دیا۔ کہہ گئی ہے: میں آپ کے مسئلے کو سمجھتی ہوں۔ بہرحال مارچ کے پہلے ہفتے میں سوئٹر میرے پاس پہنچ جانا چاہیئے۔"

محسن یہ کہہ کر چپ ہو گیا مگر پھر بھی بے اطمینان سا رہا۔ اشرف نے اسے غور سے دیکھا اور کہا: "اب کیا تکلیف ہے تمہیں۔"

"یار میں سوچتا ہوں کہ تم سچ ہی کہتے تھے۔" محسن رکا اور پھر بولا، "میں سوچتا ہوں خفا بھی ہوئی، وہ تو مہاتما بدھ کی پیرو ہے، معاف بہرحال کر دیتی۔"

○

۳۱ مارچ

اس محبت کی مدت دس مہینے تیس دن ہے یعنی یکم مئی ۱۹۵۰ء کو اس کا آغاز ہوا اور ۳۰ مارچ ۱۹۵۱ء
اس کا انجام ہوا۔ اصل میں اس کا انجام مارچ کی آخری تاریخ کو ہونا تھا۔ اس صورت میں حساب
سیدھا ہوتا اور محبت کی مدت پورے دس مہینے ہوتی مگر اس وجہ سے پیدا ہوا کہ حسن مارچ کو تیس
دن کا مہینہ سمجھے بیٹھا تھا۔ آج ۳۱ مارچ کی صبح کا اخبار دیکھ کر اسے احساس ہوا کہ مہینہ ابھی
ختم نہیں ہوا ہے۔ لیکن اب کچھ نہیں کیا جا سکتا تھا۔ وہ کل ڈائری میں لکھ چکا تھا کہ محبت ختم
ہو گئی۔

مگر حسن نے محبت کی میعاد چھ ماہ رکھی تھی۔ چار مہینے تیس دن زائد المیعاد دن میں حسن
نے شاید ہی محبت کا منصوبہ سوچ سمجھ کر بنایا تھا اور اس کا پابند رہنے کی حتی الامکان کوشش
کی تھی۔ پھر بھی اسے چھ ماہ کے ختم پر توسیع کرنی پڑ گئی۔ یہ توسیع دو ماہ تک کی گئی۔ دونوں مرتبہ
دو دو مہینے کی توسیع دی گئی۔

حسن کو دانشور کہنا یہ بات بہت دور سے جانتا تھا کہ محبت کے بغیر آدمی کی آنکھیں

نہیں ہوتی۔

مگر خود اپنی تکمیل کرنے کی وہ کوئی نیت نہیں رکھتا تھا۔ اپنی تکمیل کی نیت اسے زبیدہ کے یہاں بھی نظر نہیں آئی۔ اور زبیدہ پر اسے ایک معصوم اور پارسا لڑکی کا گمان تھا اس لیے اس کے متعلق اس نے یہ طے کیا کہ ایسی لڑکی سے شادی کی جا سکتی ہے، محبت نہیں کی جا سکتی۔ اور چونکہ مجھے شادی کرنی نہیں ہے اور چونکہ وہ بھی مجھ سے شادی نہیں کر سکتی اس لیے مجھے اس خیال سے باز رہنا چاہیئے۔ یہ بات اس نے بڑی کمی جوش و حواس سوچی اور چپ ہو گیا۔ مگر پھر اس کے ذہن میں یہ سوال آیا کہ آخر یہ بات اس کے ذہن میں آئی کیوں۔ اب تک تو اس لڑکی کے متعلق کوئی خیال اس کے ذہن میں نہیں آیا تھا۔ آخر اس نے نفسیات پڑھی تھی اور وہ اس بات سے بیخبر نہیں تھا کہ ذہن میں کسی خیال کا آنا خود ایک خطرے کی گھنٹی ہے۔ تو اس نے احتیاطاً ڈائری میں تاریخ نوٹ کر لی کہ کس دن ایسا خیال پہلی مرتبہ اس کے ذہن میں آیا۔ یہ سوچ کر کہ مبادا کوئی قصہ شروع ہو جائے۔ اور قصے کی انتہا نہ معلوم ہو ابتدا تو معلوم ہونی چاہیئے۔ یہ ۲۷ فروری ۵۸ء کی بات ہے۔

۲۷ فروری ۵۸ء کے بعد سے اس نے اپنی تھوڑی سی نگرانی شروع کر دی۔ بات یہ ہے کہ وہ محبت کے الجھیڑے میں نہیں پھنسنا چاہتا تھا تو جب زبیدہ کا خط آتا تو وہ اپنے آپ سے دور کھڑے ہو کر اپنے آپ اس خط کے اثرات کا مشاہدہ کرتا۔ اور جب زبیدہ کا فون آتا تو ایک حسن فون پر باتیں کرتا اور دوسرا حسن کونے میں کھڑا ہو کر فون پر باتیں کرنے والے حسن کو تکتا رہتا۔ مگر پھر دوسرا حسن خود ہی رفتہ رفتہ ڈھیلا پڑ گیا۔

پھر ایک روز حسن نے کسی قدر تردد کے ساتھ منصور سے کہا کہ "یار اس لڑکی کا معاملہ کچھ گڑبڑ ہے۔"

"اچھی؟" منصور نے بہت اشتیاق سے پوچھا۔

"ہاں یار" حسن نے [illegible] اور خط بہت لکھتی ہے۔"

"اور تم؟"

"میں بھی لکھتا ہوں۔"

"تو محبت ہو گئی ہے؟"

محبت کے لفظ پر حسن بہت بھڑکا۔ اور اس کے بعد اس نے اچھے خاصے دنوں تک اس مسئلہ پر مقصود سے کوئی بات نہیں کی۔ مگر پھر عزیز سے باتیں کرتے کرتے یہ لفظ خود ہی اس کے منہ پر آ گیا "بابا۔ مجھے اندیشہ ہے کہ مجھے اس سے محبت تو نہیں ہو گئی۔"

"محبت؟" عزیز نے تحقیر آمیز لہجہ میں کہا "وہ کیا ہوتی ہے؟"

"پتہ نہیں بابا۔" حسن نے شرما کر اٹھ گیا "مگر وہ خط بہت لکھتی ہے اور میں بھی خط بہت لکھتا ہوں۔"

"تو سیدھی بات کہو۔ ایک لڑکی پٹا رہی ہے مگر ویسے وہ خط کیا لکھتی ہے۔"

حسن نے دفعتاً بگڑ کر عزیز سے کہا "نہیں بابا ایسا معاملہ نہیں۔ ہماری خط و کتابت انٹلکچوئل مسائل پر ہوتی ہے۔"

"انٹلکچوئل مسائل پر؟" عزیز پھر سلگ گیا "انٹلکچوئل مسائل پر خط و کتابت لڑکی سے۔"

حسن نے پھر وضاحت کی "بابا وہ لڑکی ویسی نہیں۔"

"کیسی نہیں" عزیز نے غصہ سے کہا۔

"حسن نے دبے لہجہ میں کہا "وہ بہت سنجیدہ لڑکی ہے بابا۔"

عزیز نے اپنے غصہ پر قابو پا کر کہا "دیکھو حسن یہ لڑکی سنجیدہ ہوتی ہے۔ مگر کوئی لڑکی سنجیدہ نہیں ہوتی جو لڑکے کو چکر میں پڑ جاتی ہے۔ انٹلکچوئل خط لکھے گی۔ مگر کوئی لڑکی یہ نہیں پسند کرے گی کہ اس سے انٹلکچوئل خط و کتابت کی جائے۔

[illegible]

[illegible]

سطح ہے اس سے بلند ہو کر وہ نہیں سوچ سکتی" چپ ہوا۔ پھر بولا "دو تین لڑکیوں سے پالا پڑا وہ بھی ایسی ویسی نہیں۔ کسی شریف تعلیم یافتہ لڑکی سے اس کا ربط ہوا ہی نہیں۔ ایسی لڑکی ہمیشہ یہ دیکھتی ہے کہ کیا آپ اس سے ذہنی طور پر برتر ہیں۔ ذہنی لحاظ سے اپنے سے کمتر کو وہ قبول نہیں کر سکتی۔"

اصل میں عورت کے بارے میں مقصود کے اپنے نظریات تھے اور عزیز کی اپنی ایک مخصوص بصیرت تھی۔ دو بصیرتوں کے درمیان لڑھک رہا تھا۔ مگر موت اور عورت، ان دو کے سامنے آدمی اکیلا ہوتا ہے۔ اپنی ہی بصیرت ہو تو کام آتی ہے جس بصیرت سے محروم تھا۔ اس نے فاضلی سے اپنی اس کوتاہی کا اعتراف کیا۔ پھر کچھ درس مقصود سے لیا اور کچھ زانوئے ادب عزیز کے سامنے تہہ کیا۔ درس عزیز یہ کہتا تھا کہ عورت سفنکس ہے۔ جو عورت تمہارے پاس آتی ہے وہ ایک سوال بن کر آتی ہے۔ اگر تم نے اس کے سوال کو سمجھ لیا تو تم نے سے تو دیا نہیں تو وہ تمہیں توڑ دے گی۔ مقصود عزیز کی ایسی سب باتوں کو سن کر بس یہ بات کہتا تھا کہ پرانے لوگوں نے عورت اور مرد کے رشتے کو صحیح طور پر سمجھا ہی نہیں۔ عورت اور مرد ایک دوسرے کے حریف اور مقابل نہیں ہیں۔ درمیان کوئی جنگ نہیں ہے۔

جس ایک وقت مقصود اور عزیز دونوں کا قائل تھا تو کبھی وہ عزیز سے بحث کرتا جب وہ سامنے ہوتا اور اسے اس قلعہ کو توڑنے اور یہ معرکہ سر کرنے کی بات کہتا۔ اور کبھی بیٹھے بیٹھے وہ بحث وہ بحث سے اور منصب میں داخل ہو رہا ہے۔

[illegible] آپ کو محفوظ محسوس کرتی ہیں۔ مگر اس معذرت نے اور قدرتی یہ معذرت [illegible] منفی مزاج میں دب گئی۔ اس نفرت نے اس پر دہری تلوار جو فیصلہ نہ پر لڑکی [illegible] مکالمہ [illegible] ہے۔ اس نے اس خط کا جواب بہت سوچ سمجھ کر دیا۔ درکھا کہ میری ذات میرا جہنم ہے۔ میں اس سے نجات چاہتا ہوں۔

اس دانشورانہ رومانی لہجہ میں بہت سے خط حسن نے لکھے اور بہت سے جواب زبیدہ نے دیئے۔ مگر پھر حسن تھک گیا اور اس نے سوچا کہ میں نے محبت کو ایک علمی مسئلہ بنا دیا ہے۔ حالانکہ وہ ایک سیدھا سچا انسانی تجربہ ہے۔ اس احساس کے تحت اس نے اپنے صبا رفتار قلم کو تھوڑی سی لگام دی۔ یہ لگام تو اس نے دے لی مگر یہ سمجھ میں نہ آیا کہ اب وہ کیا کرے۔ اسی الجھن میں اس نے ایک روز منصور سے کہا "یار سچ مچ تو اس بیوقوف نہیں ہوں"۔

منصور نے اس کی بات سنی اور جواب دیا "محبت کرنے والا بیوقوف ہوتا ہے چالاک بن کر تو محبت نہیں کی جا سکتی۔

کہیں اسی وقت عزیز بھی آن دھمکا۔ اس نے خود اس نظریئے کی تردید کی "یہ کون کہتا ہے، آدمی جب تک مکار نہ ہو، محبت نہیں کر سکتا"۔

مگر عزیز نسبتاً باقی عشقوں کا زیادہ قائل نہیں تھا۔ منصور نے اس مسئلہ پر بحث کی کوشش کی کہ یہ عشق کی قیمت کا سوال ہے یا مکاری کا۔ لیکن عزیز نے اس کی ساری بحث کاٹ کر حسن سے [illegible] سیدھی بات بتا دو۔ چکر کیا ہے۔

حسن نے منہ لٹکا کر جواب دیا "یار خط و کتابت بہت [illegible]"

"اسے مختصر کر دو"

"مگر کیسے کروں"

"[illegible]

[illegible] ہوتے ہیں [illegible] ناولوں سے استفادہ کرتی ہیں۔ مگر لفظ خواہ وہ [illegible] سے ماخوذ ہوں یا [illegible] سے [illegible] ہے [illegible] مگر انگریزی ناولوں سے استفادہ کرتے [illegible] کرتے [illegible] کرو"

"مشکل ہے" اس نے اک بیچارگی کے احساس کے ساتھ کہا۔

"مشکل ہے تو پھر اس قصہ پہ خاک ڈالو اور اس لڑکی پہ لعنت بھیجو۔ ورنہ تم مارے جاؤ گے۔ پوچھو کیوں؟"

"کیوں؟"

"میری جان وہ یوں کہ محبت کوئی دائمی چیز نہیں ہے ہر جذباتی صورت حال کی ایک مدت ہوتی ہے اور اس کے کچھ تقاضے ہوتے ہیں۔ یہ تقاضے اس مدت میں پورے ہونے چاہئیں۔ اگر مرد ان تقاضوں سے کترائے گا تو عورت اس پہ لعنت بھیجے گی اور متنفر ہو جائے گی۔ اگر عورت دامن بچائے گی تو مرد اسے ٹھوکر مارے گا اور الگ ہو جائے گا۔ تو جس اس کے کہ وہ تم پہ لعنت بھیجے اور تم سے متنفر ہو تم اسے ٹھوکر مارو اور الگ ہو جاؤ۔"

مقصود نے عزیز کو حقارت کی نظروں سے دیکھا اور پھر وہ کتاب جو وہ ابھی ابھی خرید کر لایا تھا کھول کر پڑھنی شروع کر دی جیسے وہ عزیز کی باتیں متوجہ نہیں سن رہا۔

حسن چونکہ رومانٹک آدمی نہیں تھا۔ اس لئے اس نے ایسے خیالات کا ہمیشہ احترام کیا تھا۔ مگر اس وقت وہ کسی قدر مذبذب تھا۔ عزیز نے پھر کہا "ٹھوکر مارو ہی نا اور یہ کہتے کہتے اس نے ایک اور حکمت اگل ڈالی "عورت کو ٹھوکر مارو۔ عورت تمہارے قدموں پہ گرے گی۔ عورت کو سجدہ کرو۔ عورت تمہارے سر پہ سوار ہو جائے گی۔ عورت کی عزت کرو گے تو عورت تم سے نفرت کرے گی۔ عورت کو جتنا چاہو۔ وہ تمہارے سر چڑھ جائے گی۔

عزیز چلا گیا تو مقصود نے کتاب بند کی اور اطمینان کا سانس لیا۔ "احمق و گمراہ آدمی ہے پھر باتیں کرتا ہے۔" اس دیا پہ کے بعد اس نے کھڑا ہو کر کہا "عورت سے ملنے کے لیے اپنے آپ کو تو پرست لیت ان کے احسان کا مانو نہیں ہے۔ سن تمہارے ساتھ خرابی یہ ہے کہ تم اپنے آپ کو تو نہیں سکتے اپنے آپ کو اپنے بنانے کے پہ دنہیں کر سکتے۔ مگر خیر تو پہ رگی جا سکتی ہے اور عورت کو تم اس کی عزت کر کے ہی جیت سکتے ہو۔"

حسن نے کچھ باتیں عزیز کی سنیں، کچھ باتیں مقصود کی سنیں۔ کچھ باتیں اس نے کتابوں میں پڑھ رکھی تھیں۔ اور کتابوں میں باتیں پڑھنے کے بعد اس نے اپنے متعلق طے کیا تھا کہ وہ رومانٹک آدمی نہیں ہے۔ مگر ان دنوں مختلف باتیں اور مختلف نظریات و تصورات اس کے ذہن پر گہرے ہو گئے تھے۔ اور اسے پتہ نہیں چل رہا تھا کہ وہ کس نظریے کا آدمی ہے۔ مگر آخر وہ دانشور تھا۔ اس نے اس نظریاتی فساد کو رفتہ رفتہ ایک واضح نقطۂ نظر میں تحلیل کیا اور مقصود اور عزیز کو مخاطب کر کے عزیز سے کہہ دیا کہ مجھے تم سے شادی کرنی ہے۔"

"شادی!" عزیز نے نہایت تحقیر کے ساتھ حسن کو دیکھا۔ "شادی اور محبت کا آپس میں کیا تعلق ہے؟"

مقصود نے طمینان کے لہجے میں کہا۔ "حسن تم نے ٹھیک کیا۔ کیا جواب دیا اس نے؟"

"وہ خفا ہو گئی۔"

"اسے خفا ہونا چاہیے تھا۔" اب عزیز نے طمینان کا لہجہ اختیار کیا۔

مقصود نے عزیز کی بات سنی ان سنی کی اور فلسفی کے لہجے میں کہا۔ "اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ تم سے نفرت کرتی تھی۔"

عزیز نے کہا۔ "نہیں، اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ نفرت نہیں کرتی تھی، سچی محبت کرتی ہے۔"

"کیا مطلب!" مقصود نے غصے سے پوچھا۔

"مطلب یہ ہے کہ جب لڑکی نفرت کرتی ہے تو شادی کی بات پر خوش ہوتی ہے جب محبت کرتی ہے تو شادی کی بات پر خفا ہوتی ہے۔ اور اگر محبت میں لڑکی شادی پر راضی ہو جائے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ محبت نہیں کرتی تھی۔ اور اگر محبت میں لڑکی شادی پر خفا ہو جائے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ محبت کرتی ہے۔ شادی اور محبت دو الگ الگ چیزیں ہیں۔ ایک عقل کا رویہ ہے، دوسری جبلت کا۔"

بہرحال اب حسن نے ایک واضح موقف اختیار کر لیا اور عزیز اور مسعود کے نظریات اختلافات اس پر اثر انداز نہیں ہو سکتے تھے۔ کہنے لگا کہ "یار بات یہ ہے کہ میں رومانٹک آدمی نہیں ہوں۔ اور ہر تجربہ کی اک عمر ہوتی ہے۔ میرے تجربہ کی عمر پوری ہو چکی۔ ویسے میں عجلت پسند نہیں ہوں۔ میں نے ایک ہفتے کا مارجن رکھا ہے۔"

مسعود نے تھوڑا بیزار ہو کر سوال کیا "اس سے تمہاری کیا مراد ہے؟"

"میری مراد یہ ہے کہ آج مارچ کی ۲۳ ہے یہ مہینہ بہرحال اپنے تجربے کے لئے وقف ہے۔ اس میں کچھ ہوا اور ظاہر ہے کہ کچھ نہیں ہوگا تو اس مہینہ کے ختم پر میں باقاعدہ اور قطعی طور پر اس تجربے کے ختم کا اعلان کر دوں گا۔"

عزیز نے ٹکڑا لگایا "صحیح فیصلہ ہے۔ بات یہ ہے کہ ہمارے عہد میں محبت کے تجربے کی عمر اتنی طویل نہیں ہو سکتی جتنی مجنوں اور فرہاد کے عہد میں تھی۔ اور ان کے لیے عشق ہول ٹائم جاب تھا۔ ہمارے لیے پارٹ ٹائم ہی کر سکتے ہیں اور اسے لمبا نہیں چلا سکتے۔

"مجھے بس ایک بات کی فکر ہے۔" حسن نے کہا۔

"کیا؟" عزیز نے سوال کیا۔

"میں نے اپنے خطوط میں بعض بہت کام کی باتیں لکھی ہیں۔ ان خطوط کی نقلیں میرے پاس محفوظ نہیں ہیں۔ اور اب مجھے یہ بھی یقین نہیں کہ اصل بھی میرے پاس محفوظ رہیں گی یا نہیں۔"

عزیز نے اس کا حوصلہ بڑھایا "یہ ہے کہ تم زندگی میں مشہور آدمی بننے کے قابل نہیں بنتے۔ تمہارے خطوط ضائع کر دیے جائیں گے۔ مگر اگر مشہور شخصیت بنے تو یہ خطوط تمہارے بعد پارٹ کر کے شائع کرے گی یا وقت اپنے سامان میں محفوظ چھوڑ جائے گی کہ محققین ان پر کام کریں۔"

چونکہ حسن کو یہ یقین تھا کہ وہ اپنے عہد کی مشہور شخصیت بن کر رہے گا اس لیے اسے یہ سن کر خاصی پریشانی ہو گئی۔ بات یہ ہے کہ میں نے بعض خطوط میں سخت گھپلے کیے

ہے۔ ڈارنس کا بیان سارتر سے منسوب کر دیا اور سارتر کا نظریہ کامیو کے منہ میں ڈال دیا۔
اور کہیں کہیں ایکسپریشن بھی بہت کمزور ہو گیا ہے بلکہ شاید کچھ محاورے کی بھی غلطیاں
ہوئی ہیں۔" اپنے خطوں کی فکر حسن کو کئی دن پریشان کیے رہی۔ آخر اس سے رہا نہ گیا اور اس
نے زبیدہ کو خط لکھا کہ فلاں فلاں خط میں حوالے کی غلطیاں ہیں۔ انہیں درست کر لیا جائے۔
اور جن فقروں کا ایکسپریشن کمزور ہے انہیں سمجھا جائے کہ میں نے نہیں لکھے ہیں۔ ایک
خط میں ایک محاورہ غلط لکھا گیا ہے سے درست کر لیا جائے۔

زبیدہ کے نام حسن کا یہ آخری خط تھا۔ یہ خط ۳۰ مارچ کی صبح کو لکھا گیا۔ اسی
مارچ کی رات کو حسن نے اپنی ڈائری کا ورق بھرے ہوئے لکھا کہ آج مارچ کا آخری دن ہے
مارچ کا بھی اور میری محبت کا بھی۔ اس تجربہ کی میعاد طے شدہ پروگرام کے مطابق آج ختم ہوئی ہے۔

۳۱ مارچ

[illegible] اطمینان کا سانس
[illegible] محبت کا تجربہ کیا اور اس میں سے کامیاب نکل آیا۔ کامیاب کے معنی پر وہ تھوڑا [illegible]
[illegible] لوگوں کو [illegible] جو [illegible] لوگوں کو جو تجربے
[illegible] محبت کا [illegible]
[illegible] کامیاب قرار دیا۔ اس نے اپنی
[illegible] کو شمار کیا اور طے کیا کہ وہ [illegible]
[illegible]
[illegible] ایک خاص [illegible]
[illegible] ہو گیا۔

[illegible] فرحت تھی۔ فرحت کے ساتھ ساتھ ہلکے [illegible] اس نے ایک
[illegible] زبیدہ کی کے ساتھ ان سارے دنوں کی محبت کو [illegible] جس دن

غفلت کا شکار رہے تھے۔ اس نے پھر سے سرگرم ہونے کا تہیہ کیا اور تولیہ کاندھے پر ڈال لپک جھپک غسل خانے میں داخل ہو گیا۔

اس نے غسل غسل صحت کی طرح کیا۔ یا جیسے اس نے کوئی لمبا سفر کیا ہو۔ اور نہا دھو کر ساری تھکن ساری گرد اتار دینا چاہتا ہو۔ جیسے وہ غم و غصہ کی گرد میں اٹا ہوا تھا اور ذلتوں اور نجستوں نے اسے میلا کر دیا تھا۔ اور اس نے اشنان کیا اور وہ پوتر ہو گیا۔ غسل سے وہ اپنے پھول سے بدن اور خوشبو روح کے ساتھ ایک نیا آدمی بن کر نکلا۔

کپڑے پہنتے پہنتے اس کی نظر اس نیلے خط پر جا پڑی جو کئی دن سے میز پر کھلا پڑا تھا۔ اس خط کو اٹھا کر یوں پڑھا جیسے وہ کسی قدیم قلمی نسخہ کا مطالعہ کر رہا ہے۔ جس بے تعلقی کے ساتھ اس نے اسے اٹھایا تھا اسی بے تعلقی کے ساتھ اسے پھر میز پر ڈال دیا۔ نہایت فضول قسم کا خط ہے۔ میں نے کیا لکھا تھا۔ اس نے ایک تلخ سے احساس کے ساتھ پچھلے مختلف خطوط کا دھیان کیا۔ مگر اچانک اسے یکایک خیال آیا کہ محبت کی میعاد تو ختم ہو چکی ہے۔ اس قسم کے کسی مسئلہ پر غور و فکر کرنے کا وقت نہیں ہوگا۔ اور آج پہلی ہے اور اسے بہت کام نپٹانے ہیں۔

عجلت میں کپڑے پہنے اور عجلت میں ناشتہ کیا کہ آج پہلی تھی اور اسے بہت کام نپٹانے تھے۔ مگر ناشتہ کرتے کرتے اس نے اخبار پر بھی ایک نظر ڈالنے کی کوشش کی۔ ۳۱ مارچ اس نے اخبار کی تاریخ کو پھر غور سے دیکھا۔ تو گویا آج پہلی نہیں ہے یعنی مارچ کا مہینہ ختم نہیں ہوا ہے۔ یعنی اپنی میعاد تمام نہیں ہوئی ہے۔ مگر دوسرے سانس میں اس نے سوچا کہ جو لکھا گیا وہ لکھا گیا۔ کل میں اپنی ڈائری کھو چکا ہوں۔ اور اب محبت کا کھاتہ اک دوبارہ شروع نہیں کیا جا سکتا۔

جب وہ پوری طرح تیار ہو گیا اور گھر سے نکلنے کو تھا تو اسے خیال آیا کہ اسے واقعی آج ہی سے زندگی کا نیا پروگرام شروع کرنا ہے۔ مگر اسے تو یہ ہونا تھا کہ مارچ کے ختم تک پرانا پروگرام چلے گا۔ اور مارچ ابھی ختم نہیں ہوا ہے۔ تو کیا میں اس نتیجے کی تجدید کروں

نہیں۔ وہ تجربہ تمام ہو چکا۔ پھر؟ اور اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ پھر وہ کیا کرے۔ پورا دن خالی پن کے ایک پہاڑ کی مثال اس کے سامنے کھڑا تھا۔

اس مارچ۔ مارچ کی اکتیس اگر مارچ ہی کا حصہ ہے تو نبت کی میعاد کہاں سے ختم ہو گئی۔ اور اگر نبت کی میعاد ختم ہو چکی ہے تو اس دن کو کس خانے میں ڈال جائے۔ گذرتے بسرتے دنوں میں کوئی کوئی دن عجیب طرح اڑ کر کھڑا ہو جاتا ہے اور کسی خانے میں مقید ہونے سے انکار کر دیتا ہے۔ اور جس پہ قید نہ کر سکا کہ آج کا دن اسے کیسے گذارنا ہے۔ اس نے اپنے کمرے کا جائزہ لیا۔ کتابوں پر نظر ڈالی۔ کتابوں کو اس نے کتنے دنوں سے ہاتھ نہیں لگایا تھا۔ الٹ پلٹ کتابوں پہ گرد کی تہہ جمی دیکھ کر اس نے سوچا کہ لگے ہاتھوں آج کتابوں کو درست کر کے رکھ دو۔

بہت دیر تک وہ کتابوں کو جھاڑتا رہا۔ جھاڑ پونچھ کر قرینے سے ترتیب دیتا رہا۔ الماری میں کتابیں سجانے کے بعد اس نے میز پہ بکھری کتابوں کو جمع کیا اور سلیقے سے ترتیب دیا۔ ردی کاغذ کو چاک کیے پھر توڑ مروڑ کر ٹوکری میں ڈالے۔ پھر اس نے وہ نیلا خط اٹھایا۔ چونکہ اس خط میں کوئی خاص بات لکھی ہوئی نہیں ہے اس لیے اسے محفوظ رکھنا بے سود ہوگا۔ مگر توڑتے مروڑتے ہوئے اس نے یونہی وہ خط کھولا اور اسے پڑھنا شروع کر دیا۔ ایک دفعہ پڑھا۔ پھر دوسری دفعہ بہت آہستہ آہستہ پڑھا۔ پھر اس نے اپنے ہاتھوں کو دیکھا جو کتابیں صاف کرتے کرتے بہت میلے ہو گئے تھے۔ اس نے ہاتھ رومال سے صاف کیے۔ پھر بے خطا کو پکڑا اور احتیاط سے تہہ کر کے لفافہ میں رکھا اور میز پہ رکھ دیا۔

جب ساری کتابیں صاف کرنے اور سجانے کے کام سے وہ تھک گیا تو تھکن کے راستے ایک افسردگی کی کیفیت اس پہ طاری ہو گئی۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ آنکھیں بند ہوئیں تو تصور میں بچہ کھل گیا۔ نیلے کاغذ پہ لکھے ہوئے سب لفظ جی اٹھے اور اس کے تصور میں منڈلانے لگے۔ بے اختیار جی چاہا کہ وہ ان لفظوں کے جواب میں لفظ لکھے۔ ان کی انگلیوں میں وہی

بے چینی پیدا ہوتی جو پچھلے دنوں خط لکھنے سے پہلے پیدا ہوا کرتی تھی اور جب وہ قلم اٹھاتا تو سارے بدن کا جی انگلیوں میں اتر آتا، پوروں میں آکر ٹھہر جاتا اور لفظ قلم سے کاغذ پر یوں لکھا جاتا جیسے ہونٹ ہونٹوں پر بوسہ نقش کرتے ہیں مگر پھر اس نے فوراً جھرجھری لی قصہ پاک ہو چکا ہے۔ اب جو کچھ اس نے سوچا وہ محض رومانٹسزم ہے۔ تضیع وقت ہے۔

اس نے سونے کی کوشش کی مگر تھک جانے کے باوجود اسے نیند نہیں آئی۔ اس نے کتاب اٹھائی اور پڑھنے کی کوشش کی۔ وہ بہت سے صفحے پڑھ گیا مگر پھر اس نے بیزار ہو کر کتاب بند کر دی۔ اصل میں اس نے اپنے رومانٹسزم پر قابو تو پا لیا تھا مگر لگتا تھا کہ اس کے اندر کسی علاقہ میں یہ شعور بغاوت کی آگ بھڑکی ہوئی ہے۔ جیسے یہ باغی علاقہ اپنی خود مختاری کا اعلان کر دے گا۔ اس نے بغاوت کو سختی سے کچلنے کی کوشش کی اور اپنے ارادے کو پورے شعور کے ساتھ بروئے کار لایا۔ مگر بدامنی قائم رہی۔ جیسے دو سانڈ آپس میں لڑ رہے ہیں۔ اور اس کی ہستی چیخ کر دیزہ ریزہ ہو کر رہ جائے گی اور اس نے کہ علم و حکمت کے موتی کتابوں سے چن چن کر اپنی شخصیت کی تعمیر کی تھی۔ محسوس کیا کہ اس کے اعضا لیتی سے جوڑ سے گئے ہیں۔ اس نے محسوس کیا۔ کہ اس کے جوڑ بند کھل رہے ہیں اور وہ ایک ملبہ بننا چاہتا ہے۔

پنجم اپریل۔

اس نے اس فقیر کی صورت صبح کی جس کے اعضا رات کو بکھر جاتے تھے اور صبح کو جڑ جاتے تھے۔ اس نے اپنے آپ کو اکٹھا کیا اور اطمینان کا سانس لیا کہ ماضی گذر چکا ہے اور وہ صحیح و سالم نکل آیا ہے۔

بستر سے وہ اک انکسار بٹ کے ساتھ اٹھا۔ آئینہ دیکھا میلی چیپڑ بھری آنکھوں کو صاف کرتے ہوئے اس نے سوچا کہ وہ کتنے برسوں سے نہیں نہایا ہے۔ تولیہ کاندھے پہ ڈال وہ

غسل خانے میں چلا گیا۔

نہا دھو کر اس نے کپڑے بدلے، بال سنوارے۔ چلتے چلتے اس نے میز کی چیزیں درست کیں۔ پہلے خط کو اس نے بے تعلقی سے دیکھا۔ اسے مٹھی میں لا اور ردی کی ٹوکری میں ڈال دیا۔ اور پھر وہ باہر نکل گیا۔

جب وہ گھر سے نکلا تو دن چڑھ چکا تھا۔ چاروں طرف دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔ چار قدم میں اس کا سایہ اس کے برابر ہو گیا۔ بس اڈے پر پہنچی خاصی بھیڑ تھی کئی بسوں کو اس نے یہ سوچ کر گزر جانے دیا کہ ان میں رش بہت ہے لیکن جب رش کسی قدر کم نہ ہوا تو اس نے ہمت کی اور بار بار ٹوکتا بس میں گھس گیا۔

پیچھے میں بیٹھے بیٹھے مسافر اس کے آگے پیچھے دائیں بائیں اس طرح کھڑے تھے کہ اس کے بیٹھنے کی گنجائش نہ تھی۔ اس نے سوچا کہ کیا وہ اپنی سفید قمیض کو اس غلاظت بھری بس سے سلامت پھر نکال سکتا ہے۔

رفتہ رفتہ وہ اپنی سفید قمیض کو بھول گیا۔ بس کی بساند اس کے دل و دماغ پر اترتی تھی۔ اس نے جھنجھلا کر ہوا کی مکھیوں کے انبار کے درمیان کھڑا رہا۔

اس نے ایک بار پھر بیٹھنے کی کوشش کی۔ ایک مسافر کے نزدیک پر وہ بیٹھنے میں کامیاب ہو گیا۔ جھٹکے آدمی کے برابر سے ہٹ کر آگے سرک گیا۔ یہ قدرے بہتر جگہ تھی۔ وہ آسانی سے سانس لے سکتا تھا۔

ایک گوری گردن اس کے سامنے کی نشست پر دبی تھی۔ اس نے اوپر سے نیچے تک سر سے پاؤں تک کو نظر بھر کر دیکھا۔ پھر اس کی نظر اس شاداب لمبی باہوں پر گئی جو کہنی سے تک کھلی ہوئی تھیں۔ وہ اسے دیکھتا رہا۔ مگر پھر اسے احساس ہوا جیسے وہ اس شاداب جسم کو ایک بے تعلقی سے دیکھ رہا ہے۔ پھر اس گلشن بدن کو نظر بھر کر دیکھا اور دیکھتا رہا۔ مگر اسے دیکھتے ہوئے اس کی طبیعت اداس ہوتی چلی گئی۔ اس وقت اسے احساس ہوا جیسے وہ سالم نہیں ہے۔ جیسے اکثر ہوتے

ہوئے اس کا کوئی ریزہ، کوئی کنکی باہر پڑی رہ گئی ہے۔ جیسے اس کے جہنم کا کوئی انگارہ کہیں باہر پڑا دہک رہا ہے۔ میری ذات میرا جہنم ہے۔ میرے جہنم کے سب انگارے میرے اندر رہنے چاہئیں۔

اپنے جہنم سے باہر نکلنے کی نیت باندھتے ہوئے اس نے سوچا کہ اس پہلی لڑکی شاکرہ کے اس کے پیچھے دو فون بھی آ چکے ہیں، خط بھی آ چکا ہے اس سے ملنا چاہئے۔ مگر اس ارادے سے بھی اس کے اندر گرمی پیدا نہیں ہوئی اور وہ اس بس سے یوں اترا جیسے اس پہلے ہجوم میں پھنس کر وہ ٹوٹ پھوٹ گیا ہے۔

بس سے اتر کر وہ آگے جانے کی بجائے گھر کی طرف واپس چلا۔ میری رات ابھی ختم نہیں ہوئی ہے۔ میرے اجزا جنون نقش ہیں۔ اور چلتے ہوئے اسے یوں لگ رہا تھا جیسے وہ کم ہوتا چلا جا رہا ہے۔ جیسے اس کے جہنم کے انگارے رستے میں گرتے چلے جا رہے ہیں اور گھر پہنچتے پہنچتے وہ بجھ جائے گا۔

اپنے بکھرے انگاروں کے ساتھ وہ واپس گھر پہنچا۔ کمرے میں داخل ہو کر سب سے پہلے اس کی نظر ردی کی ٹوکری پر گئی۔ اس نے وہ مڑا تڑا خط نکالا۔ اسے احتیاط سے تہہ کیا اور پھر میز پر رکھ دیا۔ اور اس نے ڈائری میں یکم اپریل کا صفحہ کھول کر لکھا۔ ۳۱ مارچ، پھر وہ، گھنے ورق الٹتا چلا گیا اور ان پر لکھتا چلا گیا ۳۱، مارچ، ۳۱، مارچ، ۳۱ مارچ۔

○

فراموش

سڑک سے ذرا ہٹ کر اونچے اونچے دو دھیا کھمبے، سیمنٹ کا اجلا چبوترہ اور وہ حوض جس میں شفاف ہمکیلا پانی ایک منوازن رفتار اور آواز کے ساتھ نالیوں کے ذریعہ بہتا اور نکلتا رہتا، وہ منقش کوٹھڑی جس پر سنہرے لفظوں میں لکھا ہوا تھا "خطرہ ہے" اور ان سب سے ہٹ کر بیس تیس قدم پر ایک سبک سفید پختہ سی کوٹھی جیسے کبوتری نے ابھی ابھی انڈا دیا ہو، ان سب سے مل جل کر کچھ ایک ہی قسم کی فضا پیدا ہوتی تھی یا وہ سب سے مل جل کر ایک ہی قسم کی فضا سے پیدا ہوئی تھیں۔ نرم نرم اجلی اجلی فضا، لیکن سڑک نہ تو یہاں سے شروع ہوتی تھی اور نہ یہاں ختم ہوتی تھی۔ اپنے محلے کی گلیاں طے ہو چکتیں تو آبادی ختم ہوتی نظر آتی اور وہ سڑک شروع ہو جاتی جو آبادی سے باہر بھی تھی اور آبادی کی نشانیاں بھی رکھتی تھی۔ بچپنے میں اتر کر کسی پیڑ نیم سے ایک ٹہنی توڑ کر مسواک بناتا اور دانتوں سے چباتے ہوئے پھر اسی لمبی سڑک پر ہو لیتا چنگی کی چوکی جہاں کبھی میلے اجلے زرد خربوزے، کبھی ہری ہری ککڑیوں کی چھابڑی، کبھی گہرے سبز کریلوں سے لدے گدھے کھڑے نظر آتے۔ پھر وہ رول رول کرتا ہوا رسٹ جس کا اونٹ اور گریبر دست بستہ اسی بے کیف سے انداز میں چکر کاٹتا رہتا۔ پھر ٹیوب ویل کا سیمنٹ والا حوض اور وہ کھمبے اور وہ کوٹھی

کوٹھی سے آگے بہت دور تک دونوں طرف کھلا میدان جہاں کہیں کہیں بہت دور بہت سی بھینسیں خواب میں چلتی اور چرتی نظر آتیں۔ اور اسکے بعد اچانک سڑک موڑ کھاتی اور مشن اسکول کی سرخ عمارت سامنے آجاتی اور اس سے خاصی دور بیٹھے کی خاموش کالی چمنیاں دکھائی دیتیں جو قریب آتی جاتیں، قریب آتی جاتیں اور پھر سامنے سے پیچھے کیطرف ہو جاتیں۔ اور اسکے بعد ایکا ایکی ریل کی پٹڑی سڑک کو کاٹ جاتی۔ یہ اپنی آخری حد تھی۔ اوسے کا وہ سفید کٹہرا کھلا ہو یا بند میں نے کبھی پٹڑی کو عبور کرنے کی خواہش ہی محسوس نہیں کی تھی۔ پاٹ پڑتا، نیچے کے کڑوے سفید ریشوں سے دانتوں کو ملتا دانتوں، آموں کے گھنے درختوں کے نیچے سے ہوتا ہوا کہ شاید کوئی کچی امیا یا تھد پڑ جائے۔ بیٹھے کی چپ چاپ چمنیوں اور مشن اسکول کی سرخ عمارت اور خواب میں چلتی ہوئی اور چرتی ہوئی بھینسوں کی مبہم نشانیوں سے گزرتا ہوا سیمنٹ والے حوض پر پہنچ کر دم لیتا۔ دانت صاف کر کے کلی کرتا، منہ ہاتھ دھوتا اور جیب اتار، مٹی میں اٹے ہوئے ہیر ٹھنڈے ٹھنڈے پانی میں ڈال دیتا۔ عجب فرحت ہوتی۔

فرحت اور آسودگی تو اس فضا میں بسی ہوئی تھی۔ جانے دن بھر یہی عالم رہتا تھا یا یہ فضا اس وقت سے مخصوص تھی۔ کبھی رات کو بہت حبس ہوا تو بے تکے اسوقت کالے کلوٹے ننگ دھڑنگ لڑکے حوض میں چھلانگیں لگاتے پانی اڑاتے دکھائی دیتے تھے، ویسے تو خاموشی ہی رہتی تھی۔ بس سیمنٹ کی نالیوں میں رکتا بہتا اجلا پانی بچوں کی مدھم کلکاریوں جیسا شور پیدا کرتا رہتا۔ یا کبھی کبھی کوٹھی کے سامنے سے گزرتے ہوئے ریڑھی کی ایک سفید گیند گدے سے کھانے لگتی۔ میں ٹھٹھک جاتا۔ اس خاموش فضا میں یہ ننھی سی بات بھی ایک شور، ایک واقعہ بن جاتی۔ کم از کم ایک دفعہ کو تو میں چونک ہی پڑا تھا گیند کے پیچھے پیچھے ایک جوان سا لڑکا کہ منہ سے تو کرتا تھا دوڑتا آتا اور بغیر کسی طرف دھیان دیئے گیند اٹھا کر اسی یکسوئی سے واپس دوڑتا اور کوٹھی میں داخل ہو کر نظروں سے اوجھل ہو جاتا۔ تبھی کبھی کے اس واقعہ سے ہی مجھے اندازہ ہوا تھا کہ کوٹھی غیر آباد نہیں ہے اور انجینئر صاحب کے نام کی جو تختی دروازے پر آویزاں ہے وہ معنی اور مطلب رکھتی ہے۔ سامنے سڑک پر گدے کی گیند کو دیکھ کر کبھی تو میں یوں چونکا کہ اس سفید جلی پھاٹکی کوٹھی کا کوئی حصہ اچھل کر سڑک پر آ پڑا ہے۔ کھلی فضا میں گول گول ستونوں اور خموں والی سفید عمارت

[illegible] کی بہت سی چٹانوں کو دیوار بنا کر سڑک کو بنایا گیا ہے۔

[illegible] ایک اور واقعہ ہوا۔ [illegible] کے بعد [illegible] سڑک پر چلتے ہوئے [illegible] قدم رک گئے۔ [illegible] ہاتھ [illegible] دیا [illegible] سڑک پر [illegible] ہوا [illegible] نے [illegible] کر دیا [illegible] کالی سڑک پر [illegible] چاک سے بہت [illegible] حرفوں میں لکھا ہوا تھا۔ فراموش [illegible] چل پڑا [illegible] ایک [illegible] ٹھٹھک سی گیا اور دوسرے میں پڑ گیا کہ [illegible] سڑک کی [illegible] کو [illegible] انگلیوں یا [illegible] انگلیوں [illegible] فراموش کے لفظ سے باتیں اور یادیں بھی تو وابستہ ہیں۔ شاید ان کا یہ کرشمہ ہو۔ [illegible] کے موسم میں یہ لفظ [illegible] بچپن میں [illegible] خاصے ایک دھماکے کا کام کرتا تھا۔ کسی نے [illegible] بال [illegible] دکان [illegible] دیا اور [illegible] سے کہہ دیا۔ فراموش [illegible] ہاتھوں میں ایک [illegible] سی بندھ گئی۔ [illegible] جیسے [illegible] کسی نے سارا [illegible] سے کس دیا ہو۔ چینی کے [illegible] پر بہت تکلف سے سر پوش ڈھکا ہو۔ خیال ہوتا کہ کوئی تقریب ہوئی ہے اور کوئی بہت بڑی بلند ہستی اس تقریب سے [illegible] ہے۔ اور [illegible] ہاتھ [illegible] کی طرف [illegible] ایک [illegible] فراموش جیسے کسی نے [illegible] کی [illegible] [illegible] کوئی [illegible] پڑھ کے [illegible] ہوں۔ [illegible] دکان [illegible] دو سو [illegible] [illegible] اس [illegible] سے [illegible] بکڑی ہوئی [illegible] سے [illegible] چھڑا [illegible]۔

دوسرے دن جب [illegible] وہاں سے گزرا تو وہ [illegible] باقی تھی اگرچہ [illegible] ہو گئی تھی، اور اس [illegible] پکھلا کر [illegible] اس خاص وقت پر موقوف نہیں۔ سارے دن ہی اس سڑک پر آمد و رفت کا سلسلہ برابر [illegible] رہتا ہے۔

[illegible] مٹی میں [illegible] گئی۔ [illegible] بالکل ہی مٹ گئی [illegible] آئی گئی ہوئی۔ اپنا [illegible] کی طرف [illegible] سڑک سے موڑ [illegible] گزر کر [illegible] سکوں کی [illegible] عمارت سے پرے۔ [illegible] کی فراموش کا [illegible] سے اوٹھر [illegible] کی [illegible] کو [illegible] ہوا [illegible] اور [illegible] حوض میں [illegible] ہوئے [illegible] ہاتھ [illegible] ہوتا، [illegible] واپس گھر کو [illegible]۔

فراموش [illegible] اپنے [illegible] میں ایک گرد [illegible] لیکن [illegible] کہ [illegible] نے [illegible] اور

نہ یہ کہ پتہ ہوتی کہ سفید اُدھاسی دیوار کو کس نے کوئلے سے کالا کیا ہے۔ وہی پَچ پَچ خط ٹیڑھے میڑھے خم اور دائرے سے الٹا ایک اطمینان سا ہو گیا کہ کسی راہ چلتے نٹ کھٹ لڑکے کی وہ شرارت نہیں تھی۔ یہیں کہیں کوئی بچہ رہتا ہے شاید اسی کوٹھی والا گیند کھیلنے والا بچہ ہو، جسے موسم کے بہانے اس لفظ کا چسکا پڑا ہے۔

واپسی میں میں نے دیکھا کہ ایک شخص کرسی پر بیٹھے میری طرف تھی اور شب خوابی کے لباس اور ادھیڑ عمری کے باوصف پتورے افسری کی چغلی کھاتا تھا۔ ہاتھ میں چھڑی لیے دیوار کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ اور مالی سر نیوڑھائے دیوار لیپ صاف کر رہا ہے جیسے اس میں ساری خطا اسی کی ہے۔

دوسرے تیسرے دن کا ذکر ہے کہ اسی مقام پر اسی خط میں وہ لفظ پھر لکھا نظر آیا، اور میرے واپس ہوتے ہوتے وہ پھر صاف کر دیا گیا تھا۔ اسکے بعد ایک مرتبہ نہیں کئی مرتبہ میں نے جاتے ہوئے وہ لفظ لکھا دیکھا اور واپسی میں وہ مٹایا جا چکا ہوتا یا مٹایا جا رہا ہوتا۔

انہی دنوں باہر جانا نکل آیا۔ باہر جانا تو ہوتا ہی رہتا تھا۔ کبھی محصول وصول کرنے گاؤں کو، کبھی مقدمے کے چکر میں شہر کو۔ آج تھانے میں کھڑے ہیں تو کل تحصیل میں اور پرسوں ضلع کچہری میں۔ زیادہ سے زیادہ تین دن چار دن، کسی اہلکار نے بہت ستایا تو ہفتہ عشرہ ہو گیا۔ پر اب کے تو پورے پندرہ دن لگ گئے۔ یہ الگ بات ہے کہ اتنے دن کی واپسی پر بھی موسم ویسا ہی تھا۔

دوسرے دن جب میں نے اپنا دورہ پھر شروع کیا ہے تو یاد کیتا ہوں کہ وہ لفظ اسی مقام پر اسی خط میں پھر لکھا ہوا ہے۔ مگر حیرانی کی اب کونسی بات رہ گئی تھی۔ بلکہ اب تو اس لفظ کے مٹنے اور نقش ہونے کی تکرار بھی اپنے درد کا جزو بن چلی تھی۔ ہاں حیرانی اس پر ہوئی کہ تکرار کی یہ زنجیر ٹوٹ گئی واپسی میں لفظ کو جوں کا توں دیکھ کر گمان ہوا۔ کہ آج انجینئر صاحب اور انجینئر صاحب کے ملازم دونوں کی نگاہ چوک گئی مگر حد ہو گئی کہ دوسرے دن بھی وہ لفظ اسی خط میں اسی مقام پر اسی طرح لکھا ہوا تھا۔ اب ماتھا ٹھنکا کہ یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے۔ سو سو طرح کا شک پڑا کہ انجینئر صاحب کیا لمبے دورے پر نکل گئے یا کہیں تبادلہ تو نہیں ہو گیا۔ کیا خبر ہے کہ بیمار پڑے

ہوں۔ گانوں کی دوڑ کی لمبی ہوتی گئی۔ مگر گنتی گنتی ہوتی رہی۔

برسات اب کی بار دیر سے لگی۔ تیسری دوپہروں کا سلسلہ ٹوٹنے ہی میں نہ آتا تھا۔ دن کو رات کو حبس۔ اور آندھی کا کوئی وقت مقرر نہ تھا کہ کبھی دن ڈھلنے سے پہلے اندھیرا ہو جاتا اور کبھی رات کی اندھیری میں اندھیاری پھیلنے لگتی۔ کوٹھوں اور منڈیروں پر کتنی مٹی اڑ گئی تھی اس کا اندازہ تو پہلی بوچھاڑ پڑنے پر ہوا۔ ایک روز صبح ہی صبح آنکھ کھلی تو یہ چیز کھلی دھلی اور نکھری نکھری نظر آئی جس نیم سے روزانہ ٹہنی توڑ کے مسواک بناتا تھا وہ نہا دھو کر کتنا ہرا بھرا ہو گیا تھا۔ درخت اور کھیت اور دیواریں سب ہی میں ایک شادابی کی دوڑ دوڑ رہی تھی۔ ہاں سیمنٹ والے حوض میں آج پانی نہیں چل رہا تھا۔ بس بارش کا مٹیالا پانی رکا کھڑا تھا۔ انجینئر صاحب کی کوٹھی بھی جھاڑوں اور آندھیوں کی گرد سے اٹی پڑی تھی۔ پھر سفید انڈا سی نظر آنے لگی اور وہ نقطہ کالے کوٹ سے لگے ہوئے حرف ڈھل کر روشن روشن ہو گئے تھے۔

برسات کیا آئی کہ مہینے کی چھٹی لگ گئی۔ دن بارش، رات بارش سوکھے تالاب بھی بھر گئے خشک نالوں کی کھڑی بھیگ بھیگ کے کالی پڑنے اور کلکلانے لگی اور دل میں سے نیم سفید سا آب کا پرنالہ [illegible] اب کی بھی پانی کی [illegible] اور کھلنے لگی۔ انجینئر صاحب کی کوٹھی کی صفیں دیواروں پر [illegible] نمایاں نہیں [illegible] وہ نقطہ [illegible] حرف کی پھیلی ہوئی سیاہی کو دیکھ کر [illegible] کھل رہے ہیں۔ ف کا نقشہ تو بالکل [illegible] نقطے [illegible] ہو کر [illegible] ہو رہی ہو۔ [illegible] بالکل [illegible]

[illegible] نقطے ایک رابطہ صاف ہو گیا تھا۔ اس [illegible] کی یوں [illegible] ہیں۔ [illegible] نشانیوں کا [illegible] پتے [illegible] سے سفر کی نوعیت [illegible] ہے۔ [illegible] ہیں [illegible] ہیں [illegible] ہیں [illegible] رہٹ، [illegible] عمارت [illegible] ہیں۔ [illegible] تو

میں اب یہ لفظ بھی ایک سنگِ میل بن گیا تھا۔ اس سنگِ میل کو چھوتے ہی لگتا کہ ہی میل یوں سٹے ہوئے اور سیل کی پٹڑی اب آئی کبھی کبھی یہ سنگِ میل منزل بن جاتا۔ گویا اسے چھونے کے لیے ہی گھر سے نکلے تھے اور اگر ریل کی پٹڑی تک جاتے ہیں تو محض وضعداری کی خاطر۔

برسات ڈھلنے لگی۔ مہینہ کا زور ٹوٹ چلا۔ گھٹا ایسی گھر کے آئی، جیسے ٹوٹ کے پانی پڑے گا۔ مگر دم بھر پانی پڑا اور آن کی آن میں صاف صاف۔ بڑی بڑی سونی جامنوں کی جگہ چھوٹی چھوٹی بدرنگ جامنیں آئیں۔ پھر چھوٹی جامنیں بھی غائب ہونے لگیں۔ چوراہے کے پیپل سے سرخ اور سرخ سے پیلے ہوئے سانپ کی چھتریاں جس تیزی سے پھولی تھیں، اسی تیزی سے مرجھا گئیں۔ طوطوں کے بچے نیم کی کھوکھلی سے نکل کر شاخوں پر آ گئے تھے۔ اور ٹہنی ٹہنی پھدکتے پھرتے تھے۔ مگر تالاب گھٹتے گھٹتے یہاں تک کہ پانی بیٹھ سوں کے گھٹنوں تک رہ گیا۔ گری ہوئی پتوں، جھکی ہوئی کڑیوں اور چھجوں اور پھر ٹوٹتی دیواروں کی مرمت شروع ہو گئی تھی اور راستوں میں سے ڈھئی ہوئی دیواروں کا ملبہ ہٹنے لگا تھا۔ بجز اس کے کوٹھی کے احاطے میں چونے کی پوری دکھی نظر آئی تو کچھ عجیب سا احساس ہوا۔ یہ رنگ دیواروں کا جا مزہ لیتے ہوئے نظریں اپنے ٹھکانے پر جا کر اٹک گئیں۔ ف کا نقطہ پہلے ہی مٹ چکا تھا۔ اب میم کی گٹھی بھی کھل چلی تھی۔ شبین کی بیل کھل اور پتھرا گئی تھی۔ رسی کے بل کھل رہے تھے۔ بکھر رہے تھے مگر اب تو کوچی کے ایک اشارے پر یہ پورا کا پورا اچھوتی افسانہ حرفِ غلط بن جاتا کا اس خیال سے جی اک ذرا اداس سا ہو گیا۔ پہلی مرتبہ احساس ہوا کہ یہ نقطہ سنگِ میل نہیں، رستے کا وہ جو اپنی جگہ پر کھڑا دور سے اشارہ کرتا رہتا تھا اور دور تک اشارہ دیتا رہتا تھا۔

چونے کی پوری احاطے میں ڈیڑھ دو دن جوں کی توں رکھی رہی۔ پھر ٹیے پڑے۔ ڈھول بجے۔ نقارے بجے۔ جن پر تو کی گھل رہی تھی، اور دو تین کو چیلیں اور ایک بیٹھی۔ دوسرے دن کوٹھی کو بیس سے اور بھی حالت میں دیکھا۔ اندر کے بڑے حصے میں قلعی ہو چکی تھی مگر باہر کی دیواروں کو ابھی نہیں پہنچا گیا تھا۔ دوسرے دن دیکھا کہ ساری کوٹھی پر سفیدی ہو گئی ہے ..... مگر میں ہکا بکا رہ گیا ..... باہر کی دیوار پر اس اہتمام سے سفیدی کی گئی تھی کہ فراموش، اپنی جگہ پر

تھی کہ تھی اور اس سینے سے کہ جو تلے کی ایک بوند کسی طرف پہ نہیں پڑی تھی۔ میں کھڑا کا کھڑا رہ گیا اور گویا
ایک رسی سے میرے ہاتھ پیر دل کو اس طرح جکڑ لیا کہ میں نہ آگے بڑھ سکتا تھا نہ پیچھے ہٹ سکتا تھا۔

اس کے بعد سی میں پہلے دو رات بڑی گل گئی۔ اب کے دورہ لمبا تھا۔ واپس آیا اور اس کوٹھی
کے برابر سے نکلا تو دیکھا کہ برآمدے میں بچے بے طرح دھما چوکڑی مچا رہے ہیں۔ اندر کے کمرے
سے ایک خاص نسوانی احتجاج کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ پھر ایک مردانہ ڈانٹ۔ مجھے
بڑا اچنبھا ہوا۔ بچے بڑے عورتیں، مہینوں اور موٹی اور نرم رسیلی اور درشت آوازوں کے یہ رنگ
برنگے تار کہ ایک جان بن کر پھیل رہے تھے آخر یہ نئی زندگی اچانک کیسے اور کہاں سے پھوٹ پڑی
خاموش برآمدے اور احاطے، شیشے والے بند دروازوں اور گنگ کمروں کی کایا ایکا ایکی کیسے پلٹ گئی
سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ بس سوچ لیا کہ کہیں سے مہمان آئے ہوں گے۔

دوسرے دن کوٹھی کا چوں بدلا نظر آیا۔ دور سے پتہ چل رہا تھا کہ سفید سی ہوئی ہے۔ بچے تک کے
ہاتھ کی کھڑکی کے اور بہت دنوں میں رکھے تھے، کہ جیسے رات کا کام کرتے کرتے نہیں چھوڑ سکتے ہیں اور
آنکھ پر ہاتھ سے ڈھک جاتی ہے۔ میرے قدم ناداستہ تیز تیز اٹھنے لگے۔ کوٹھی کے قریب پہنچتے ہی میری
کار سے ہی پاس والی دیوار کو ٹھوکر والی دھک سے رہ گئی۔ صاف سی دیوار پہ سفید سی پتی ہوئی تھی۔ اور
نیچے پہ نقشوں شوشوں اور نمونوں سے پورا موا وہ بالا سفید سی میں ڈوب چکا تھا۔ اچانک پھر کسی نے
میرے سر پہ ہاتھ دیا اور آپ ان دیکھی سی پیٹھ جکڑ سے رہی تھی۔

[illegible] کی قلعی کی پاہر کی روش پہ [illegible] جھاڑیوں کی [illegible] شاخوں اور پتوں
[illegible] سے [illegible] تھا۔ اب تو واقعی [illegible] کا یوں بھی اب وہ مالی [illegible] کوئی
[illegible] ساد گی سے کا [illegible]

[illegible] سے پوچھا۔ "[illegible] صاحب کے [illegible] معلوم ہوئے ہیں؟"

"[illegible] کی قلعی اسی طرح چلتی رہی [illegible] انجینئر صاحب کے کچھ والے ہیں"

"[illegible] انجینئر صاحب" میں چونکا اور نگاہ فوراً اس کی تختی پر گئی۔ تختی واقعی بدلی ہوئی تھی۔ مالی اسی
طرح ہاتھ روکے بغیر سادگی سے بولا۔

"ہاں جی اب سنئے انجینئر صاحب آ گئے ہیں۔ پہلے انجینئر صاحب تو گئے"

"کہاں"؟ "انہوں نے پنشن لے لی۔

"پنشن؟ اچھا!" مجھے یہ بات نہ جانے کیوں اتنی عجیب معلوم دے رہی تھی چند لمحے خاموشی رہی۔

بس ہری شاخوں میں قینچی کے درد کرنے کی آواز آتی رہی۔ پھر مالی آپ ہی بولا، اور اس مرتبہ اس کی آواز میں افسوس کی بھی ایک کیفیت تھی۔ "اجی اچھا ہی ہوا کہ ان کی پنشن ہو گئی۔ جب سے ان کا بیٹا مرا تھا ان کا دماغ چل بے چل ہو گیا تھا۔"

"بیٹا؟ اچھا بیٹا مر گیا تھا انجینئر صاحب کا!" یک بیک الجھی ہوئی ڈور کا سرا ہاتھ آ گیا

"نہیں جی وہ بیٹا نہیں تھا"۔ مالی نے قینچی روکی۔ قینچی زمین پر ڈال کر سیدھی کر، میری طرف رخ کر کے کھڑا ہو گیا۔ انجینئر صاحب بچارے تو اکیلے تھے۔ وہ ان کا لے پالک تھا۔ بہت لاڈ کرتے تھے اس کا۔ بس دو دم تھے۔ انجینئر صاحب اور بے پالک۔ اور کیا دیکھنا رہ گیا تھا انہیں۔ بس، سے دیکھ دیکھ کے جیتے تھے۔ نہ کسی سے ملنا، نہ کسی کے پاس جانا، نہ کوئی میل ملاقاتی۔ دفتر یا دورہ وال سے سیدھے گھر، نہ کوئی قصہ کہنیڑا، اسی کے ساتھ مگن رہتے تھے۔ . . . اسے لوں لگ گئی۔ کل کی طرح مر جھا گیا۔ . . . . مالی کسی سوچ میں ڈوب گیا۔ پھر آپ ہی آپ بڑبڑایا: "انجینئر صاحب پھر اکیلے رہ گئے۔ بہت دکھی رہتے تھے بچارے۔ بالکل کھوئے کھوئے سے رہنے لگے تھے۔ نوکری سے بھی جی اچٹ گیا تھا۔ اب دورے پر بھی ایسے ویسے ہی جاتے تھے۔ بس اسی کا خیال ہر وقت رہتا تھا۔ اس کی ایک ایک چیز کو گنیدا، اور بیٹے کو سنبھال کے رکھ چھوڑا تھا۔ . . . . . اچھا ہی ہوا پنشن لے لی۔ بالکل چل بے چل ہو گئے تھے۔" اس نے بہت سے جھک کر قینچی اٹھائی۔ اور میری طرف دیکھے بغیر دوسری روش کی طرف ہو لیا۔ کھلے میدان میں کہیں کہیں بہت دور اکا دکا نواب میں چمنی اور پیپل کی جو ٹی بھیس، بیدہ دو دو یہ آموں کے ثمر درخت کہ ختم ہونے میں نہ آتے تھے۔ مشن اسکول کی سرخ عمارت عمارت سے کہیں بہت آگے نکل کر بیٹھے کی کالی کالی چپ چپ چمنیاں جو قریب ہونے کی بجائے دور ہوتی نظر آ رہی تھیں۔ اس روز وہ لمبی اونچی نیچی گرد آلود سڑک کہ کبھی سیدھی چلتی اور کبھی ٹیڑھی کی دکھائی دیتی اتنی لمبی لگی کہ میں بیزار ہو کر ریل کی پٹڑی کو چھوڑے بغیر واپس ہو گیا۔

بادل

وہ بادلوں کی تلاش میں دور تک گیا۔ گلی گلی گھومتا ہوا ایک کوئیں پر پہنچا۔ وہاں سے نیچے
رستے پر پڑ لیا اور کھیت کھیت چلتا چلا گیا۔ خاصا سمت سے ایک گھنے راگھ میں کی چھتری
[illegible] اس نے روکا اور پوچھا کہ "وہ بادل آئے تھے؟"

"بادل؟" گھنے رستے نے اس تعجب سے کہا جیسے اس سے بہت انوکھا سوال کیا گیا ہو۔

"ہاں بادل" اور جب گھنے رستے کی حیرت میں کوئی کمی نہ آئی تو وہ اس سے مایوس ہو کر آگے
بڑھ گیا۔ اس نے کھیت میں ایک ہل چلاتے ہوئے کسان سے یہی سوال کیا "وہ بادل آئے تھے؟"
کسان کی سمجھ میں یہ سوال نہ آیا۔ اس نے ٹھٹھک کر کہا "بادل؟" "ہاں بادل"

[illegible] سے تعلق رکھنے والے پوچھ رہے تھے جیسے [illegible] والا [illegible]
[illegible] کے تعلق پوچھنا شاید بادل کی [illegible] سے کوئی [illegible]
رہا تھا۔ [illegible] پوچھنے سے پوچھ رہا تھا مگر کسی نے اسے تشفی بخش جواب نہیں دیا۔

سب سے پہلے اس نے [illegible] سے یہ سوال کیا تھا "[illegible] بادل [illegible]"

"کون کہاں گئے؟" اماں جی نے اس سے ایسے پوچھا جیسے اس نے بہت احمقانہ سوال کیا تھا۔

"بادل"

"بادل ـــــ رہے تیرا دماغ چل گیا ہے۔ جا پہلے جا کر منہ ہاتھ دھو، ناشتہ کر اور سکول جا۔"

اماں جی کے اس انداز بیان نے اس پر ایک ناخوشگوار اثر چھوڑا۔ اس نے بے دلی سے ہاتھ منہ دھویا، ناشتہ کیا اور کتابوں کا بیگ کندھے میں ڈال سکول کے لیے گھر سے نکلا۔ مگر گھر سے نکلتے ہی اس کے ذہن میں پھر وہی سوال ابھرا، بادل کہاں گئے؟ اور اس کے ساتھ اسے رات کا وہ وقت یاد آیا جب اس نے بادل امنڈتے گرجتے دیکھے تھے۔ جب وہ سونے لگا تھا اس وقت آسمان بادلوں سے خالی اور ستاروں سے بھرا ہوا تھا۔ ہوا بند تھی اور گرمی سے نیند نہیں آ رہی تھی۔ اسے مشکل سے نیند آئی۔ پھر جانے کب وقت تھا کہ اس کی آنکھ کھل گئی۔ جو وقت بھی ہو اس کے لیے وہ آدھی رات تھی۔ دور آسمان پر بادل ایک گرج کے ساتھ امنڈ رہے تھے۔ بیچ بیچ میں بجلی چمکتی اور اس چمک میں وہ بادل بہت کالے کالے نظر آتے۔ اسے لگا کہ بہت زور کی بارش آئے گی مگر اس میں نیند کتنی خراب ہوتی۔ بس اسی اندیشے سے اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ ایسے ہو گیا جیسے اسے پتہ ہی نہیں ہے کہ آسمان بادلوں سے بالکل خالی تھا اور صحن میں بوندیں پڑنے کے کوئی آثار نہیں تھے۔ سب سے پہلے تعجب ہوا۔ پھر افسوس ہوا۔ تعجب اس پر کہ بادل اتنے امنڈ گھمڈ آئے تھے اور برسے نہیں پھر گئے کہاں۔ افسوس اس پر کہ وہ سو کیوں گیا۔ جیسے وہ جاگتا رہتا تو بادل گھنے ہونے سے اوجھل نہ ہو پاتے اور پھر برس کر ہی جاتے۔ وہ بارش ہو جاتی تو موسم کی پہلی بارش ہوتی۔ مگر اس کے سوتے ہوئے بادل گھر کر آئے اور چلے گئے۔ بارش کی کوئی بوند نہیں پڑی۔ برسات کا موسم خالی گزرا جا رہا تھا۔ اس نے چلتے چلتے ایک بار پھر آسمان کا جائزہ لیا۔ دور تک کوئی بادل نہیں تھا۔ خالی آسمان میں سورج جیسا اس کے سر پر چمک رہا تھا۔ وہ سکول کا رستہ چھوڑ کر کھیتوں میں نکل گیا۔

کچی تھوڑے سے پتلی پتلی جیوں پر ہوتا ہوا وہ نکل گیا۔ دھوپ بہت تیز تھی۔ اس کا بدن پھنکنے لگا حلق خشک ہو گیا۔ کئی کھیت پار کرنے کے بعد گھنے پیڑوں والا ایک پیڑ دکھائی دیا کہ اس

کی تیاری میں کئی دن چل رہا تھا۔ گویا ریگستان میں چلتے چلتے نخلستان آ گیا۔ اس نے درخت کی چھاؤں میں بیٹھ کر کتابوں کا بیگ ایک طرف رکھا۔ کنوئیں کے پاس پہنچ کر اس نے رسّے سے نکلتے ہوئے پانی سے پیر دھوئے۔ ہاتھ منہ دھویا اور کلیجہ تک بھر کر پانی پیا۔

منہ ہاتھ دھو کر پانی پی کر آنکھوں میں ٹھنڈک اور روشنی آئی اب اس نے ارد گرد کا جائزہ لیا۔ قریب کے ہی ایک درخت پر ایک بڑے میاں بیٹھے حقہ پی رہے تھے۔ اس نے کئی دفعہ بڑے میاں کی طرف دیکھا۔ کچھ کہنا چاہا مگر پھر ہمت چھوڑ بیٹھا۔ آخر اس نے ہمت باندھی اور بولا "بابا جی! ادھر بادل آئے تھے؟"

بڑے میاں نے حقہ پیتے پیتے اسے غور سے دیکھا۔ پھر بولے "ہاں بادل چھپ کر آئیں گے۔ جب گھر کر آئیں گے تو آسمان زمین کو چھپا لیں گے۔"

"مگر رات تو بادل آئے تھے اور کسی کو پتہ ہی نہ چلا۔"

"رات بادل آئے تھے؟" بڑے میاں نے کچھ سوچا۔ پھر اونچی آواز سے اللہ دین سے مخاطب ہوئے "اللہ دین رات بادل آئے تھے؟"

اللہ دین بیلوں کو ہانکنے لگا۔ بولا "میں تو رات کھاٹ پر پڑتے ہی سو گیا تھا۔ مجھے پتہ نہیں۔"

پھر بڑے میاں بولے "بادلوں کے خالی آنے سے کچھ نہیں ہوتا۔ میں نے سنا ہے پچھلے دس سال سے بارش نہیں ہوئی تھی۔"

"دس سال سے؟" اس کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔

"ہاں دس سال سے۔ مگر بادل آئے تھے۔ میں نے دیکھا تھا۔ ایک دفعہ ایک بار بہت گھر کے آئے تھے۔ مگر پانی کی ایک بوند نہیں پڑی۔"

"عجیب بات ہے۔"

"عجیب بات کوئی نہیں۔ بارش اس کے حکم سے ہوتی ہے۔ اس کا حکم ہوتا ہے تو بادل

برستے ہیں اس کا حکم نہیں ہوتا تو بادل نہیں برستے۔"

بڑے میاں کے اس بیان کے ساتھ ساتھ اس کے تصور میں کچھ مختلف گھٹائیں امنڈ آئیں وہ گھٹائیں جو گھٹ ٹوپ اندھیرے کے ساتھ اٹھیں جیسے برس کر جل تھل کر دیں گی۔ مگر یہ برسنے بغیر گزر گئیں۔ وہ گھٹائیں جو بے معنی سی بدلیوں کی صورت میں آئیں، وہ ایسی برسیں کہ نال نالیاں امنڈ آئیں۔

بڑے میاں نے پھر آسمان کی طرف دیکھا، پھر بڑبڑائے "موسم گزرا جا رہا ہے پتہ نہیں اس کا حکم کب ہوگا؟"

جواب میں وہ بھی بڑبڑایا "مینہ برستا ہی نہیں، پتہ نہیں بادل آ کے کہاں چلے گئے۔"

"بیٹا کیا برسے، برسے گا تو خبریں آنے لگیں گی کہ سیلاب آگیا۔ آسمان بخیل ہو گیا۔ زمین کی طرف نہیں رہا۔ بارش ہوتی ہی نہیں ہوتی ہے۔ تو سیلاب امنڈ پڑتا ہے۔"

بڑے میاں کی باتیں اس کی سمجھ میں کچھ آئیں کچھ نہ آئیں۔ وہ بیٹھا سنتا رہا۔ پھر اچانک اسے خیال آیا کہ بہت دیر ہو گئی ہے تالابوں کا جائزہ لینا، گلے میں ڈال اٹھ کھڑا ہوا۔

مٹی ولول دھوپ میں وہ دیر تک بیٹھا رہا جن راستوں سے پانی اترنے والا تھا وہ راستے پر بیٹھا رہا۔ دھوپ اب بھی تیز تھی مگر جب وہ پکی کوئیں کے پاس پہنچا تو اسے لگا کہ ہوا میں ایک ٹھنڈی لکیر سی تیر رہی ہے اور قدموں کے نیچے مٹی کچھ گیلی گیلی ہے۔

بستی میں داخل ہوتے ہوئے اس نے دیکھا کہ رستہ یہاں سے وہاں تک گیہوں، دھنیا کے کھیت دھوپ میں دمک رہے تھے اب نہائے دھوئے نظر آ رہے ہیں اور زمین پر پچھلی برسات کے بعد سے خشک چھا رہا تھا، رواں ہو گئی ہے خوشی کی ایک لہر اس کے اندر دوڑ گئی جب سے گاؤں پہنچنے کی جلدی تھی، وہ دیکھنا چاہتا تھا کہ اس کے تصور میں جو جو منظر تھے وہ کس قدر تازہ ہوا ہے۔

مگر بستی کو اس نے قصبہ کو بارش کے حساب سے جلا ہوا پایا۔ جامن سے بہت سے پتے پیلے

گرے پڑے تھے اور گیلی مٹی پر لت پت تھے۔ باقی درخت نہایا دھویا کھڑا تھا۔ اور ماں جی ایک آسودگی کے لہجے میں کہہ رہی تھیں "اچھی بارش ہو گئی۔ اللہ تیرا شکر ہے۔ میرا تو گرمی سے دم الٹنے لگا تھا۔"

جامن کی ٹہنیوں سے بوندیں ابھی تک ٹپ ٹپ گر رہی تھیں۔ وہ پیڑ کے نیچے کھڑا ہو گیا اور بوندوں کو اپنے سر پر اور اپنے گالوں پر لیا۔ اس کی نظر آسمان پر گئی۔ آسمان دھلا دھلا نظر آ رہا تھا۔ اب وہاں کوئی بدلی نہیں تھی۔ اسے خیال آیا کہ وہ بادلوں کی تلاش میں دھوپ اور دھول میں کتنی دور تک گیا اور بادل اس کے پیچھے آئے اور برس کر چلے بھی گئے۔ اس خیال نے اسے اداس کر دیا۔ بارش میں بھیگی ساری فضا اسے بے معنی نظر آنے لگی۔

○

اسیر

"اچھا تم یہاں کی سناؤ۔"

"یہاں کی؟ ——— یہاں کی کیا سناؤں؟"

اصل میں انور کے لیے یہ سوال غیر متوقع تھا۔ شعوری طور پر نہ سہی غیر شعوری طور پر اس نے یہ طے کر رکھا تھا کہ جو کچھ ہونا تھا وہیں ہونا تھا۔ سو وہ کرید کرید کر یہ سب کچھ دہلی کے متعلق پوچھتے جا رہا تھا۔ یہاں کے متعلق سوال ہوا تو جیسے وہ بے خبری میں پکڑ گیا۔

"یہاں کیا ہوا؟" جاوید نے پھر اپنے سوال پر اصرار کیا۔

"یہاں کیا ہوا!" وہ سوچ میں پڑ گیا ——— پھر بولا "یار یہاں کچھ بھی نہیں ہوا۔"

"کچھ بھی نہیں ہوا؟"

"سچی بات ہے، کچھ بھی نہیں ہوا۔ جو تم نے وہاں دیکھا اس کے مقابلے میں یہاں کچھ بھی نہیں ہوا۔"

"اچھا! ——— وہاں ہم یہ سمجھ رہے تھے کہ یہاں بھی بہت کچھ ہو رہا ہوگا۔"

انور نے محبت کے لہجے میں بولا۔ "ہاں یہاں کچھ نہیں ہوا۔"

"جنگ تو بہرحال یہاں بھی ہوئی تھی؟"

"ہاں حملہ تو ہوئی تھی" انور نے بیٹھتے ہوئے لہجے میں کہا۔

لنگر یہاں خود بخود رک گئی انور پچھلے پہیے پر جو گرد جمی تھی وہ اب ٹھنڈی ہو چکی تھی جاوید نے بس پر ہی پہیہ لیا تھا۔ زیادہ اشتیاق اور تجسس کا مظاہرہ نہیں کیا۔

انور پھر خود ہی بولا "اصل میں یہاں باہر سے کچھ نہیں ہوا جو کچھ ہوا اندر سے ہوا۔"

"باہر سے کوئی کچھ نہیں ہوا" جاوید نے سادگی سے کہا "جو کچھ ہوا اندر سے ہوا ہے"

"یہی بات تو نہیں ہے" انور نے سنی قدر ناراضگی سے سر ہلا کر "وہاں تو ہر طرف بھی ہوا ہے جتنا یہاں اندر سے زیادہ ہوا اس لیے جنگ کے دنوں میں کم ہوا جنگ کے بعد زیادہ ہوا"

"کیا ہوا؟"

"ہر طرف لوٹ مار مچی، جیسے جلوس، سارے معاشرہ میں کے جنگل سے نگر فتار ہوں ——

جاوید نے سامنے میز پر پڑا ہوا تصویروں والا رسالہ اٹھایا اور الٹے پلٹنے لگا۔ یہ رسالہ وہاں سے میز پر پڑا دیکھ رہا تھا مگر اس کو بات سے دیکھنے کی فرصت نہیں ملی یا دیکھنے کو جی نہیں چاہا۔ اس وقت اس رسالے نے اپنی طرف کھینچا۔ ان کی تصویریں اسے بہت اچھی لگ رہی تھیں۔

"یہ نیند بستی میں تو اچھی خاصی خانہ جنگی شروع ہو گئی ہوگی۔ مورچے بن گئے ہوں گے۔ ہر شہر میں گولیاں پوری رات گولی چلی۔"

"اچھا ہے۔" جاوید مسکرایا۔

"کیا؟"

"یہ کارٹون۔" جاوید نے رسالہ انور کی طرف بڑھا دیا۔

انور نے کارٹون دیکھا۔ کچھ دیکھا کچھ نہ دیکھا۔ بے دلی سے کہا "ہاں اچھا ہے۔" اور چپ ہو گیا۔

"یار باہر نہ چلیں۔" جاوید نے تجویز پیش کی۔

"ہاں چلیں۔"

"ہاں یار! گھر میں بیٹھے تو یہی ایک سلسلہ چلتا رہے گا۔ آنے والوں کا تانتا بندھا رہتا ہے۔ وہی سوال وہی باتیں۔ یہ نئی اسیری ہے۔ چلو چلیں۔" وہ فوراً اٹھ کھڑا ہوا۔ اندر کے دروازے کے قریب جا کر اونچی آواز سے کہا "میں ذرا انور کے ساتھ جا رہا ہوں۔" اور انور کو ساتھ لے کر باہر نکل آیا۔

"یار تمہیں سندھ کے فسادات کی خبریں ملی تھیں۔" انور کو یکایک خیال آیا کہ یہ سانحہ بہت سنگین اور المناک تھا۔ جاوید کو اس سے باخبر کرنا چاہیئے"

"ہاں ریڈیو پر خبریں سنی تھیں۔"

"ریڈیو کی خبروں سے کیا پتا چلتا۔ بہت المناک واقعات ہوئے۔ بہت لوگ مارے گئے بہت سے گھر سے بے گھر ہو گئے۔ تم نے لیاقت مارکیٹ تو دیکھا تھا۔ کتنا بڑا بازار تھا۔ پورا بازار جل کر راکھ ہو گیا۔ اور کوئی آدمی نہیں بچا ——"

"یار یہ پیٹ پر اور رانوں پر خانے سے کیسے بنے ہوتے ہیں؟" جاوید ٹھٹھک کر کھڑا ہو گیا۔

انور بولتے بولتے بیچ میں رک گیا اور اسی طرف دیکھنے لگا جس طرف جاوید دیکھ رہا تھا۔ یہ سینما ہال کے باہر آویزاں پوسٹر تھا جس پر نیم برہنہ عورت کی لانبی تصویر بنی تھی۔ اس کی بھیگی

بھری رانوں پر اور ناف تک کھلے ہوئے پیٹ پر چار خانہ بنا ہوا تھا۔ یہ تصویر جسے انور آتے جاتے ادھر ادھر دیکھتا تھا، اس وقت اسے بہت بری لگی "چھوڑو یار" اور دونوں آگے چل پڑے۔

"آئس کریم کھاؤ گے؟" انور دکان کے سامنے پہنچ کر یکایک رک گیا۔

"کھا لیں گے۔"

آئس کریم کھاتے کھاتے جاوید کی نظروں نے اس لڑکی کا تعاقب کیا۔ جو فلیپر پہنے بڑے بڑے گول شیشوں کی عینک لگائے نمودار ہوئی تھی۔ اور اس وقت تک تعاقب جاری رکھا جب تک وہ اندر داخل نہیں ہو گئی۔

"یار انور! اور خرابیے پیچھے ہیں، تم تو غائب ہی ہو گیا۔"

"اور بہت پیچھے بھی۔"

"بہت پیچھے بھی اور بہت قمیض بھی ——— یار انور! تم نے بتایا نہیں کہ یہاں کیا ہوا۔"

"جو ہوا وہ خود دیکھ ہی رہے ہو۔" انور نے آئس کریم کھاتے ہوئے طنز کے لہجے میں کہا۔ "بس تم رخصت ہو گئے، فلیپر آ گیا۔ تم اسے پیچھے واقعہ سمجھتے ہو؟"

"تم نہیں بہت بڑا واقعہ ہے۔" انور کا لہجہ اور بھی طنزیہ ہو گیا۔ رک کر بولا "کیا خیال ہے تمہارا اس بڑے واقعے کے بارے میں؟"

"میں ابھی فلیپر سے اپنے آپ کو مانوس نہیں کر پایا ہوں۔" آئس کریم ختم کرنے کے بعد اس نے پیالہ کوڑے کی پیٹی میں پھینکا "بس چلیں۔"

"ہاں چلیں۔"

دونوں آگے بڑھ لیے۔

انور اب اس سنجیدہ موڈ میں نہیں رہا تھا۔ پچھلی ہوئی چیزوں کے بارے میں جاوید کے تجسس کو دیکھ کر اس نے پوچھ لیا۔

"یار جب تم یہاں آئے ہو تو تمہارا کیا ردِ عمل تھا؟"

"ردِ عمل؟ میرا؟ کیا مطلب؟"

"میرا مطلب ہے کہ اس لمبی سیر کے بعد جب تم یہاں آئے تو تم نے کیا محسوس کیا؟"

"یار کمال ہے۔" جاوید چلتے چلتے پھر ٹھٹھک گیا۔

"کیا ہوا؟"

"یار اس نوجوان کو دیکھو، اس نے گلابی شلوار پہن رکھی ہے اور میرا خیال ہے کہ ریشمی ہے۔"

"پھر کیا ہوا؟"

"کچھ نہیں ہوا۔ چلو۔" جاوید چپ ہو گیا۔ پھر بولا۔ "کیا ریشم اور رنگ نوجوانوں میں بہت مقبول ہیں؟ میں نے اور بھی نوجوانوں کو لال پیلے، ریشمی کرتے شلواریں پہنے دیکھا ہے۔"

"ہاں اس کا اچھا خاصا رواج ہے۔ اچھا سنو، کڑھائی گوشت کھاؤ گے؟"

"کڑھائی گوشت؟"

ہاں یار! کھانے کا وقت ہے۔ ابھی گو کہاں جاؤ گے۔ کڑھائی گوشت کھاتے ہیں۔ پھر ذرا لمبی ٹہل کریں گے۔"

وہاں مجمع بہت تھا۔ سڑک پر دو رویہ موٹریں ہی موٹریں کھڑی تھیں۔ موٹروں سے پرے پورے ہوٹل میں بکھرے ہوئے فٹ پاتھ پر بھی میزیں کرسیاں بچھی تھیں اور سامنے سجی تھی۔ ان سے پرے بکرے کی ایک نہایت وسیع و عریض تصویر کے نیچے بکروں کی انتیں قطار اندر قطار لٹکی تھیں۔ بھٹیاں گرم تھیں۔ شعلے لپک رہے تھے۔

"یار یہاں تو بہت لوگ ہیں۔"

"کوئی بات نہیں۔ ابھی جگہ ملتی ہے۔" یہ کہتے کہتے انور نے دور پڑی ایک میز کو خالی دیکھ کر لپک کر گیا اور اس پر قبضہ کر لیا۔ یہ میز فٹ پاتھ پر بچھی تھی۔ جہاں پر ہی ایک کار کھڑی تھی جس کے سامنے والے ڈھکنے کو اس وقت بطور کھانے کی میز استعمال کیا جا رہا تھا۔

گوشت سے بھری ایک کڑھائی ، اس پر جھکے ہوئے کچھ لڑکے کچھ لڑکیاں

"یہ ! یہ واقعہ بھی میرے لیے کا ہے" جاوید نے اردگرد کھاتے ہوؤں پر ایک نظر ڈالی "کون سا واقعہ؟"

"یہی کڑھائی گوشت کا واقعہ۔"

"ہاں یہ اس شہر میں نئی ڈش ہے۔"

اس نے پھر اردگرد ایک نظر ڈالی۔ کاروں کی قطاروں پر، میزوں کرسیوں پر، کھانے والوں پر۔ "یہ ساتھ کے پہلے پہلے بہت خاموش ہوا کرتے تھے۔" رکا، پھر بولا "وہ عجیب بات ہے کہ سب مجمع تکے کباب اور کڑھائی گوشت کا ہے۔ پہلے تکے کباب کی بھی اتنی دکانیں تو نہیں تھیں۔"

اس کی حیرانی وقت بھی ہوئی تھی۔ اس کی نسلیں جنہیں پہچانی ہوئی تھیں، اتنی دیر ہو گئی ابھی تک لایا ہی نہیں۔"

[illegible] اردگرد کا جائزہ تقسیم سے لیا۔ بچے، بڑے، عورتیں، مرد، نازک بدن خوبصورت [illegible] سب کھانے میں مصروف تھے۔ ایک قریب کی میز پر ایک موٹا تازہ آدمی [illegible] اور اردگرد بیٹھے بیرے کھانے چن رہے تھے۔ ایک دوسری قریب کی میز پر ایک [illegible] بوڑھی عورتیں [illegible] اور [illegible] سے بھی سادھی میں ایک چھریرے بدن والی خاتون کڑھائی [illegible] خاتون کی [illegible] میں مدہوں کا [illegible] تھا۔ اس وقت وہ [illegible] کی [illegible] [illegible] سے [illegible] [illegible] گوشت [illegible] [illegible] اور لوگوں سے [illegible] [illegible] [illegible]

جاوید نے منہ میں لقمہ رکھا اور سوچا، میرا جبڑا کتنا بڑا ہے۔

"یار تم کھا نہیں رہے!"

"کھا رہا ہوں۔"

"کہاں کھا رہے ہو۔ یہاں تکلف سے کام نہیں چلے گا۔ یہ گڑھائی گوشت ہے۔ اسے کھانے کے لیے آدمی کو تھوڑا وحشی ہونا پڑتا ہے۔"

اس نے انور کی خاطر کتنی تیزی سے لیے، مگر پھر اس کی رفتار سست پڑ گئی۔ اس کا خیال کہیں سے کہیں جا نکلا۔ "یار خالد کا کیا حال ہے۔ میں ابھی تک کسی سے ملا ہی نہیں ہوں۔"

"خالد کا حال؟" انور نے لقمہ لیتے لیتے رک گیا۔ "میں نے تمہیں خالد کے متعلق نہیں بتایا تھا۔"

"نہیں۔"

انور رکا، پھر نوالہ نگلتے ہوئے آہستہ سے بولا۔ "یار! خالد گزر گیا۔"

"اچھا! ——— وہ بھی گزر گیا۔ دو سال بیت گئے۔ یار تم نے لکھنؤ کے مرنے کی خبر سنی ہے۔ ان دو برسوں میں اتنے لوگ مر گئے!"

"ان دو برسوں میں لوگ بہت جلدی جلدی مرے ہیں۔"

"اور سب بستر پر مرے ہیں!" جاوید کے لہجے میں ہلکی ہلکی حیرت تھی۔

"کیا ——— کیا مطلب؟" انور کچھ چکرا سا گیا۔

"بات یہ ہے کہ دو برس کا عرصہ تقریباً دو سال تھا۔ مرنے کے روز تک ڈاکٹروں سے ہم مانوس نہیں رہے تھے۔" رکا، پھر بولا "اسی لیے میں رشید کا مرنا عجیب سا لگا۔"

"رشید؟ رشید مر گیا؟ ——— اچھا! ——— مگر وہ تو رجشٹ ہی میں تھا۔"

"ہاں رجشٹ ہی میں تھا۔ مگر آخری دنوں میں وہ وہاں سے بھاگ کر ڈھاکہ آ گیا تھا۔ کچھ دنوں بعد سنا کہ وہ ——— پھر مر گیا ——— مگر بستر پر لیٹ کر۔"

"اچھا تو رشید مر گیا۔" انور افسوس کے لہجے میں بڑبڑایا۔

"ہاں، مگر ہم نے اسے کفن بھی دیا تھا اور دفن بھی کیا تھا۔"

انور اس کا منہ تکنے لگا کہ یہ کیا کہہ رہا ہے۔

"رشید کی موت اُس دیس میں شاید آخری روایتی موت تھی۔" جاوید نے اپنے پیچھے بیان کی وضاحت کی اور چپ ہو گیا۔

دونوں تھوڑی دیر تک چپ بیٹھے رہے۔ کچھ کھایا کچھ نہ کھایا، پانی پیا، فارغ ہو بیٹھے۔ جاوید نے پھر ارد گرد نظر ڈالی۔ بہت سے چہرے بدل گئے تھے۔ مختلف میزوں پہ نئی کڑھائیاں تھیں اور نئے کھانے والے، اور نئے چہرے کہ اسی طرح حرکت کر رہے تھے اور پھیلتے جا رہے تھے۔ اس نے اس طرف سے نظر پھیری اور پھر انور سے مخاطب ہوا۔

"تم پوچھ رہے تھے کہ میں جب سے یہاں پہنچا ہوں تو میں نے کیا محسوس کیا۔ یہی پوچھ رہے تھے نا؟"

"ہاں۔"

"یار! پہلے تو مجھے یوں لگا کہ یہاں سب کچھ بدل گیا ہے اور مجھے ایک دھچکا سا لگا۔ پھر رفتہ رفتہ مجھے لگا کہ یہاں تو کچھ بھی نہیں بدلا ہے، اور پھر مجھے ایک دھچکا اور لگا۔"

"ان دونوں تاثرات میں کیا ربط ہے؟" انور سوچ میں پڑ گیا۔

"کوئی ربط نہیں۔ اچھا خیر چھوڑو اس بات کو۔" جاوید نے فوراً مضمون بدلا، "تم کچھ سناؤ؟"

سنانے کی کوئی بات ہو تو سناؤں" اب انور اتنا سمجھ گیا تھا کہ کچھ سنانے پہ مائل نہیں تھا۔

"اچھا تم کل کس کا ذکر کر رہے تھے؟"

"کس کا؟ مجھے تو یاد نہیں۔"

"جیسے گولی لگی تھی۔"

"اچھا تم مرزا کی بات کر رہے ہو۔"

"مرزا گولی سے مرا تھا؟ گولی اسے کیسے لگی؟"

"ایسا ہوا کہ جلسے سے نکل رہا تھا۔ جلسہ ابھی ختم ہوا تھا۔ سڑک پہ بھیڑ بہت تھی۔"

"ہاں جلسے کے ساتھ یہی تو خرابی ہے کہ اس کے بعد سڑک پہ بھیڑ بہت ہو جاتی ہے۔ اچھا پھر۔"

"پھر بس یہ ہوا کہ اس نے سڑک کو عبور کیا۔ چار قدم چلا تھا کہ کسی نے گولی مار دی وہ مر گیا۔"

"گولی مار دی؟ —— اچھا —— اگر کیوں مار دی؟"

"بس مار دی۔"

"اچھا! —— عجیب بات ہے! —— پھر کیا ہوا؟"

"پھر کیا ہوتا!"

"کچھ بھی نہیں ہوا؟" اس نے دہشت زدہ لہجے میں کہا۔

"نہیں۔ ہونا کیا تھا؟"

"آدمی کو گولی لگ جائے اور پھر کچھ بھی نہیں۔ عجیب بات ہے۔ کتنی عجیب بات ہے یوں انور!"

"تم ٹھیک کہتے ہو اس سے پہلے مجھے یہ احساس ہی نہیں ہوا تھا۔"

"تمہیں یہ احساس ہی نہیں ہوا تھا؟" اس نے حیرت اور دہشت سے انور کو دیکھا۔

"ہاں یہ" اس نے ایک شرمندگی کے ساتھ کہا اور پھر تعجب سے جاوید کو دیکھنے لگا

"یار یہ!"

"ہاں کیا بات ہے۔"

"یار! اس نے دہشت زدہ لہجے میں کہا۔ ایک بار پھر کہو اور تم نے تو وہاں اس سے بہت زیادہ دیکھا ہوگا کیوں؟"

جاوید نے اثبات میں سر ہلایا۔ اس نے افسردہ لہجے میں کہا "تم ٹھیک ہی کہتے ہو —— مگر یہ تو پتا تھا کہ کیوں ہو رہا ہے —— اور یہ احساس تو تھا کہ کیا ہو رہا ہے ——"

ہندوستان سے ایک خط

عزیز از جان، محبت و اقبال نشان برخوردار کامران طول العمر و بعد دعا اور تمنائے دیدار کے
[illegible] کہ یہ زمانہ [illegible] تمہاری نہ معلوم ہونے کی وجہ سے بہت بے چینی میں گزرا۔ میں نے
[illegible] سے خیریت پہنچنے اور خیریت مطلوبہ کی کوشش کی مگر بے سود۔ ایک چٹھی لکھ کر
[illegible] کو بھیجی [illegible] کراچی کے پتے پر بھیجو اور ادھر سے چٹھی
[illegible] روانہ کرو۔ [illegible]

[illegible] کو [illegible] اور [illegible]
[illegible] اور [illegible] میں نے ایک خط
[illegible] کراچی [illegible] میں [illegible] کے [illegible]
[illegible] ایک خط اس [illegible] بھیجا ہے۔

[illegible] کی طرف سے [illegible]
[illegible] اور [illegible]

یہ جنگ کے دو سوا دو ماہ بعد کی بات ہے۔ یہ سمجھو کہ وہ گلابی جاڑا تھا۔ میں اپنا پلنگ کمرے سے دالان میں لے آیا تھا۔ رات گئے دستک ہوئی میں پریشان ہوا کہ الٰہی خیر اس غیر وقت میں کون آیا اور کیوں آیا۔ جا کر دروازہ کھولا، دستک دینے والے کو سر سے پیر تک دیکھا۔ حیران و پریشان کہ یہ کون آگیا ہے۔ خون نے خون کو پہچانا ورنہ وہاں اب پہچاننے کے لیے کچھ نہیں رہ گیا تھا۔ تب میں نے اسے گلے لگایا اور کہا کہ بیٹے ہم نے تمہیں ان حالوں تو پاکستان نہیں بھیجا تھا، تم کیا حال بنا کر آئے ہو۔ مگر پھر میں اپنے کہے پر آپ نادم ہوا۔ یہ کیا کم تھا کہ ہماری امانت ہمیں واپس کفن بن جائے۔ اور کہنے والا مستحق عذاب ٹھہرے۔ انسان ضعیف البنیان نے اس دنیا میں آنے کے بعد وہ کچھ کیا ہے کہ اس کے ساتھ جو بھی ہو اس پر شکایت کی گنجائش نہیں۔ آدمی بس چپ رہے۔ اور جبار و قہار کے قہر سے ڈرتا رہے۔

تمہاری چچی نے عمران میاں کو دیکھا تو حق دق رہ گئیں۔ گلے لگایا اور بہت روئیں۔ میں تو چپ رہا تھا مگر وہ پوچھ بیٹھیں کہ بہو کہاں ہیں۔ بچوں کو کہاں چھوڑا؟ اس پر اس عزیز کی حالت غیر ہو گئی۔ میں اور تمہاری چچی دونوں گھبرا گئے۔ پھر احتیاط برتی کہ ایسا کوئی حوالہ درمیان میں نہ آئے عمران میاں یہاں تین دن رہے مگر کیا رہے۔ نہ بولنا نہ ہنسنا۔ بس گم سم۔ تیسرے دن عمران میاں کو خیال آیا کہ میاں جانی کی قبر پر چلا جائے۔ میں نے سر پہ ہاتھ پھیرا اور کہا کہ بیٹے تم پچیس برس بعد دادا کی قبر پر فاتحہ پڑھو گے۔ مگر دن میں اس طرف جانا قرین مصلحت نہیں۔ تم اسی مٹی میں پیدا ہوئے ہو۔ پہچانے جاؤ گے۔ اس پر وہ عزیز زخمی ہوا اور بولا کہ چچا جان! میں گھر آنے سے پہلے بستی میں گھوم پھر لیا ہوں۔ اس مٹی نے مجھے نہیں پہچانا۔ میں نے کہا کہ بیٹے اب اسی میں عافیت ہے کہ یہ مٹی تمہیں نہ پہچانے۔ خیر تو میں شام پڑے عمران میاں کو قبرستان لے گیا۔ نئی قبروں سے میں نے متعارف کرایا۔ پرانی قبروں کو انہوں نے خود پہچان لیا۔ اندھیرا تھا اس لیے بعض قبروں کی شناخت میں قدرے دقت پیش آئی۔ میاں جانی کی قبر پر پہنچ کر عمران میاں کا دل بھر آیا۔ میری بھی آنکھ بھیگ گئی۔ وہ قبر بہت کہنہ ہو گئی ہے۔ سرہانے کھڑا ہوا ہار سنگھار کا پیڑ گر چکا ہے۔ تمہیں یاد ہوگا کہ میاں جانی کو ہار سنگھار کا بہت شوق تھا۔ انہوں نے باغ میں بہت شوق سے کئی پیڑ لگائے تھے اور ان

سے اتنے پھول اترتے تھے کہ سال بھر تک گھر کی بچیوں کے دوپٹے ان میں رنگے جاتے تھے اور
سردعوت پر پرانی میں ڈالے جاتے تھے۔ پھر بھی بچ رہتے تھے مگر ہارسنگھار توجہ چاہتا ہے۔ میں

مل گئی۔ بندے کو چاہیے کہ ہر حال میں شکر خدا کرے۔ حرف شکایت زبان پر نہ لائے کہ سب دا کلمہ
اکیلا اس پیڑ پر تو نہیں ہوں۔ ہارسنگھار یہ آخری پیڑ تھا جو میاں جانی کے سرہانے کھڑا رہ گیا تھا جنگ
سے پہلے والی برسات میں وہ بھی گر گیا۔ اب ہمارا باغ اور ہمارا قبرستان دونوں ہارسنگھار سے خالی ہیں۔
رہے نام اللہ کا۔ باغ بچارہ تو بیچ بھی بہت ہے۔ قبرستان سے متصل ہونے کی بنا پر قبرستان میں شمار ہوا
دو ہاتھ سے جاتے جاتے بچ گیا۔ مگر ان تیس برسوں میں اتنے پیڑ گرے ہیں اور ان کے ساتھ اتنی
یادیں دفن ہو گئی ہیں کہ اب اس باغ کو بھی قبرستان سمجھنا چاہیے۔ جو پیڑ باقی رہ گئے ہیں وہ گزرے
دنوں کے کتبے نظر آتے ہیں۔ بہرحال جو باغ کا حال ہے وہ عمر بن میاں دیکھ گئے ہیں۔ اگر پہنچ گئے ہوں
گے تو بنایا ہوگا۔ یہاں سے تو وہ اسی صبح کو چلے گئے تھے۔ رات بھر میاں جانی کی قبر کے سرہانے
بیٹھ کر گزار دی۔ میں بھی بیٹھا رہا۔ جب جھٹپٹا ہوا اور چڑیاں بولیں تو وہ عمر بن جھجھکی سے کھڑے
اٹھے اور مجھ سے رخصت چاہی۔ میں نے حیرت سے پوچھا کہ کیوں جا رہے ہو۔ آ گئے ہو تو رہو۔
بیٹھکے پن سے بولے کہ یہاں تو مجھے کوئی پہچانتا ہی نہیں۔ میں نے کہا کہ خیر اب نہ پہچانے جانے
ہی میں عافیت ہے۔ مگر وہ میری بات سے قائل نہیں ہوا۔ سفر اس پر سوار تھا۔ میں نے پوچھا
"مگر پھر جاؤ گے کہاں؟" بولا کہ جہاں قدم لے جائیں گے۔ میں نے اس کی باتوں سے اندازہ لگایا
کہ لکھنؤ جا کر وہاں سے کراچی جانے کی صورت نکالنے کی نیت ہے۔ دل تو بہت دکھی مگر کچھ اس
کا حوصلہ اور کچھ یہ ڈر کہ کہیں یہ خبر نہ نکل جائے۔ سو میں نے صبر کیا۔ اپنے بازو سے دعا کے تعویذ
کھول کر اس کے بازو پر باندھی اور اللہ کی حفظ و امان میں اسے رخصت کیا۔ چلتے چلتے تاکید کی
تھی کہ وہاں سے نکلتے ہی جس طرح بھی ہو خیریت کی اطلاع دینا۔ مگر وہ دن ہے اور آج کا دن،
خیریت کی خبر نہیں ملی۔

اُدھر کی خبر ادھر گرم پہنچتی ہے اور پہنچتی بھی ہے تو اس طرح کہ اس پر اعتبار کرنے کو

جی نہیں چاہتا۔ ایک روز شیخ صدیق حسن نے آکر خبر سنائی کہ پاکستان میں سب سوشلسٹ ہو گئے ہیں اور پیاز پانچ روپے سیر بکتے ہیں۔ یہ خبر سن کر دل بیٹھ گیا۔ مگر پھر میں نے سوچا کہ شیخ صاحب پرانے کانگریسی ہیں۔ پاکستان کے بارے میں جو خبر سنائیں گے ایسی ہی سنائیں گے۔ ان کے بیان پر اعتبار نہ چاہیے۔ چند ہی دنوں بعد ایک ایسی خبر سن لی جس سے بری افواہوں کی تردید ہو گئی؟ خبر سنی کہ مرزائیوں کو غیر مسلم قرار دے دیا گیا ہے۔ شیخ صاحب کو میں نے یہ خبر سنائی تو وہ اپنا سا منہ لے کر رہ گئے۔ اللہ تعالیٰ پاکستان پر اپنی رحمت رکھے اور اس قوم کو اس کی نیکی کی جزا دے ہم تو کفرستان میں ہیں۔ بغیر اسلامی رسوم و اطوار رکھتے ہیں اور بول نہیں سکتے۔ ہماری حویلی سے قریب ہی غیر مقلدوں نے اپنی مسجد بنالی ہے۔ وہاں وہ بلند آواز سے آمین کہتے ہیں اور ہم چپ رہتے ہیں۔

ہاں شیخ صدیق حسن تمہارے متعلق بھی ایک مژدہ سنا ہے۔ خبر سنائی کہ تم نے کوئی جوانی ہے۔ بلیٹک میں صوفے بچھے ہوئے ہیں اور ٹیلی ویژن رکھا ہے۔ یہ خبر سن کر خوشی ہوئی۔ خدا کا شکر کیا کہ یہاں کی تلافی وہاں ہو گئی ہے۔ یہاں حویلی کا حال اچھا نہیں ہے۔ پچھلی برسات میں ہوئی کڑیاں اور چھت گئیں۔ دیوان خانے کا حال تو یہ ہے کہ چھت کی طرف دیکھو تو آسمان نظر آتا ہے۔ ہماری بیکاری اور زبوں حالی کا حال تمہیں اچھی طرح معلوم ہے۔ تم کچھ روپے بھیج سکو تو وہاں بابا کی قبر کی مرمت کرا دی جائے اور دیوان خانے کی چھت پر ٹین ڈلوا دی جائے۔ اس سے زیادہ فی الحال کچھ بھی نہیں چاہیے۔ حویلی کے مقدمے کا ابھی فیصلہ نہیں ہوا۔ قبلہ بابا صاحب مرحوم ۴۸ء میں پہلے دفعہ مقدمے کے کاغذات میرے سپرد کر گئے تھے۔ خدا اللہ کرے اس وقت سے اب تک میں نے سب پیشیاں کامیابی سے بھگتائی ہیں اور ہمیشہ باقی وکیلوں سے زیادہ کیا ہے۔ خدا کی ذات سے امید ہے کہ مقدمے کا فیصلہ میرے ہی حق میں ہوگا اور جائداد میرے ہی ہوگا۔ یہ بات جس کا پتا نہیں کہ کس روز سر پر آ پڑے۔ ابھی بھی بہت کچھ مقدمہ بازوں کے میرے بعد یہ مقدمہ کون لڑے گا۔

جس طرف نظر ڈالتا ہوں، تاریکی ہی تاریکی نظر آتی ہے۔ ہمارے صاحب زادے اختر کے
لچھن یہ ہیں کہ اپنا نام پریمی رکھ لیا ہے اور ریڈیو پر جا کر ڈراموں میں پارٹ ادا کرتا ہے۔ چھوٹے
بھیا مرحوم کی صاحب زادی خالدہ نے ایک ہندو وکیل سے شادی کر لی ہے۔ اب دیکھو بی بی
سے ساڑھی باندھتی ہے اور ماتھے پر بندی لگاتی ہے۔ پاکستان میں جو خاندان کا نقشہ ہے وہ کم
پر بہت زیادہ روشن ہونا چاہیے۔ سنا تھا کہ آپا جانی کی لڑکی نرگس نے بی۔ اے مرضی سے شادی
کی ہے اور جس سے کی ہے وہ دہلی ہے۔ خود آپا جانی کا احوال میں نے یہ سنا ہے کہ وہ کھلے
منہ بیٹے کی موٹر میں بیٹھتی ہیں اور بزازوں سے منہ در منہ بات کر کے کپڑا خریدتی ہیں۔

یہ سب کچھ دیکھنے کے لیے ایک میں ہی زندہ رہ گیا ہوں۔ قبلہ بھائی صاحب مرحوم اور
چھوٹے بھیا دونوں پچھلے دنوں میں سدھار گئے۔ جب میں قبرستان جاتا ہوں اور میں دہلی
اور چھوٹے بھیا کی قبروں پر فاتحہ پڑھتا ہوں تو قبلہ بھائی صاحب بہت یاد آتے ہیں۔ کہ فی
الحال کراچی میں سے کوئی جا کر ان کی قبر پر فاتحہ بھی نہیں پڑھ سکتا۔ جو خاندان ایک جگہ جب
ایک جگہ مرا اب اس کی قبریں تین قبرستانوں میں بٹی ہوئی ہیں۔ میں نے قبلہ بھائی صاحب سے
مودبانہ عرض کیا تھا کہ اگر آپ یہیں سو رہتے ہیں تو بہتر ہے کہ آپ کا سامان بھی
کے پاس کراچی جائے۔ مگر چھوٹے بھیا کی محبت نہیں ڈھاکہ لے گئی۔ ان کی بے وقت موت
سب کے لیے بہت بڑا صدمہ تھی۔ مگر اب میں سوچتا ہوں کہ ان کے جلد ہی اٹھ جانے میں
بھی اللہ تعالیٰ کی مصلحت تھی۔ وہ نیک روح تھے۔ قدرت کو یہ منظور نہیں تھا کہ وہ
[illegible] کے دن دیکھنے کے لیے زندہ رہیں۔ یہ ان کو [illegible] دیکھنے [illegible]

[illegible]

اپنے ہمراہ دعا کرنے گئے تھے۔ جہاں افراد خاندان ضائع ہوئے وہاں وہ یادگاریں بھی ضائع ہوگئیں۔ عمران میاں یہاں بالکل خالی ہاتھ آئے تھے۔ سب سے بڑا سانحہ یہ ہوا کہ ہمارا شجرۂ نسب گم ہوگیا۔ ہمارے اجداد نے کہ سادات عظام میں سے تھے۔ تاریخ میں بہت مصائب و آلام دیکھتے ہیں، مگر شجرے کے گم ہونے کا الم ہمیں سہنا تھا۔ اب ہم ایک آفت زدہ خاندان ہیں جو اپنا ٹھکانا اور شجرہ گم کر چکا ہے اور انتشار کا شکار ہے۔ کوئی ہندوستان میں کثیف ہوا، کوئی بنگلہ دیش میں گم ہوا اور کوئی پاکستان میں در بدر پھرتا ہے۔ عقیدے میں خلل پڑ چکا ہے۔ غیر اسلامی طور اطوار اپنا لیے ہیں۔ دوسرے مذہبوں اور فرقوں میں شادیاں کر رہے ہیں یہی حال رہا تو تھوڑے عرصے میں ہمارے خاندان کی اصل نسل بالکل ہی نابود ہو جائے گا اور کوئی یہ بتانے والا بھی نہ رہے گا کہ ہم کون ہیں اور کیا ہیں۔

سو اے فرزندو! ان کہ ہم نجیب الطرفین سید ہیں۔ حضرت امام موسیٰ کاظم سے ہمارا سلسلۂ نسب ملتا ہے مگر الحمدللہ کہ ہم رافضی نہیں ہیں۔ صحیح العقیدہ حنفی مسلمان ہیں۔ اصحاب کبار کو مانتے ہیں اور اہلبیت سے محبت۔ کہتے ہیں میاں جانی کا طریق چلا آتا تھا کہ عاشورے کے دن روزہ رکھتے اور دن بھر مصلے پر بیٹھے رہتے۔ ہمارے گھر میں ایک تسبیح تھی کہ عاشورے کے دن وہ کے ہنگام سرخ ہو جایا کرتی تھی۔ میاں جانی بتاتے تھے کہ یہ خاص اس مقام کی مٹی کے دانے ہیں جہاں ہمارے جد امجد سیدنا حضرت امام حسین علیہ الصلوٰۃ والسلام گھوڑے سے زمین پر آئے تھے۔ اس تسبیح کے سرخ ہونے کے ساتھ والد مرحوم کا استغراق بڑھ جاتا۔ مگر سینہ کوبی اور گریہ سے اجتناب کرتے تھے کہ یہ بدعت ہے۔ ہاں کھچڑے کی دیگیں پکتی تھیں جو غربا و مساکین میں تقسیم ہوتی تھیں۔ تقسیم کے بعد اس ایک دیگ رہ گئی تھی۔ پچھلے برس تو اس ایک دیگ سے بھی گئے۔ تیوری کا دیگچہ پکوایا اور غربا میں بانٹ دیا۔ اگلے برس کا حال اللہ کو معلوم ہے۔ مہنگائی بڑھتی ہی جا رہی ہے اور ہمارا حال خستہ ہوتا چلا جا رہا ہے۔ بیٹے! ہمیں یہ تو معلوم ہے کہ پاکستان میں پیاز اب کس بھاؤ بک رہی ہے، مگر ایک بات سن لو تمہیں

چڑھ کر گرا نہیں کرتیں اور خلق گر کر سنبھلا نہیں کرتے۔ پس پناہ مانگو اُس وقت سے جب چیزوں کی قیمتیں چڑھنے لگیں اور لوگوں کے اخلاق گرنے لگیں۔ جب ایسا وقت آ جائے تو بندوں کو چاہیے کہ توبہ و استغفار کریں اور تلاوت کلام پاک کریں کہ عاد و ثمود کی بستیوں کے ذکر میں قہر رکھنے والوں کے لیے بہت سی نشانیاں ہیں۔

خیر میں ذکر اپنے خاندان کا کر رہا تھا۔ اُس خاندان کا جسے میں نے اکثر بھی دیکھا مگر بکھرتے ہوئے زیادہ دیکھا۔ بیان کیا ہم تینوں بھائیوں سے اپنے حضور بہن کر میں نے بانی نے کہ خدا ان کی قبر کو بارشگار کی سوگند دے بسائے رکھے، وہ فرماتے تھے کہ مجھ سے بیان کیا میرے والد مرحوم سید محمد علی نے اُس وقت جب کہ ان کا وقت موعود قریب آیا۔ فرمایا اُس جناب نے کہ مجھ سے بیان کیا میرے باپ سید رستم علی نے اُس تذکرے کے حوالے سے کہ جب میں عمارت خاندانی حالت تمام و کمال درست تھے اور جو خرابی ہو گئی اس ہنگام جبکہ ابھوں نے سنا دن میں بائیس خواجہ کی چوکھٹ کو چھوڑا اور بس یہی خاک بسر در بدر بھٹکتے اور جو سنے اس خبر کو اس سے بیان کرتا ہوں میں تم سے کہ بہ اصل میں اصفہان کی مٹی ہیں۔ جب والد ذی شہنشاہ ہمایوں نے اپنی سلطنت کے حصول کے لیے اس دیار میں اپنا لشکر اتارا تو ہمارے مورث اعلیٰ میر منصور بخارا کے فرد فرد تھے و علم احدیث کا جو بحر بیکراں تھے۔ اصفہان نصف جہاں سے اُس فلک جناب کے ہمرکاب ہوئے اور شہنشاہ کندہ تخت پر پہنچ کر جنت زہ و ایمان بنے۔ اکبر آباد میں ان کا مزار آج بھی مرجع خلائق ہے۔ قبر کی پیائش ہے کہ کتنا ایاب مٹی ٹھاکر مانگ میں ڈالتی ہیں جو بیوہ کے اندر اندر مانگ کا سیندور بن جاتی ہے۔ خالی گود بیاب مٹی آنچل میں باندھ کر لے جاتی ہیں اور بھرے بھرے گود کے ساتھ واپس آتی ہیں اور جادر چڑھاتی ہیں شاہجہاں کے وقت میں اس بزرگ کی اولاد نے اکبر آباد سے رخت سفر باندھا اور جہاں آباد پہنچی۔ چھوڑ دیا سے سنہ سنہ دن کی رہائش یہاں کی۔ ہمارے جد امجد سید رستم علی نے اپنی دولت میں سے دمڑی ساتھ نہ لی۔ بس شجرہ نسب

کو پکے کے ساتھ کمر پر قیود بندھا، کاغذات و دستاویزات کا پلندہ بغل میں دبایا اور نکل کھڑے ہوئے۔ اسی پلندے میں خاندان کا تذکرہ بھی تھا۔ راہ میں جٹ ماروں سے مقابلہ ہوا۔ اس افراتفری میں پلندہ بکھر گیا۔ کچھ کاغذات گر گئے، کچھ رہ گئے۔ گر جانے والے کاغذوں میں تذکرہ بھی تھا۔ مگر شکر ہے کہ شجرے کا ورق بھی میلا نہ ہوا۔

بہت خاک چھاننے کے بعد اس بستی سے کہ جہاں اب اکیلا تمہارا چچا خاک نشین ہے، گزر ہوا۔ یہاں کی زمین کو مہربان پا کر ڈیرا کیا۔ جاننا چاہیے کہ زمین جب مہربان ہوتی ہے تو محبوبہ کی آغوش کی طرح نرم اور ماں کی گود کے سمان کشادہ ہو جاتی ہے۔ جب نامہربان ہوتی ہے تو بیوہ کی مثال محنت اور حساب کے دن کی مانند تنگ ہو جاتی ہے۔ حق یہ ہے کہ اس زمین نے ایک مدت تک ہم پر دباؤ کی۔ اس نے ہمارے بڑھتے پھیلتے خاندان کو برس برس تک اس طرح اپنی آغوش میں سمیٹے رکھا جیسے تنگ دست بند مال کو سینے سے لگائے رکھتا ہے اور کسی کو آنکھوں سے اوجھل نہیں ہونے دیتا۔ تقسیم سے پہلے اس خاندان کے صرف تین فرد باہر نکلے تھے۔ بھائی اشرف علی بھیا فاروقی اور پیارے میاں۔ بھائی اشرف علی ہمارے چچا جانی کے بیٹے تھے اور عمر میں فاروقی صاحب سے ایک سال بڑے تھے۔ اس اعتبار سے تمہارے ابا جو ماشاء اللہ سے ڈیڑھ کا کاٹ تھے اور باہر کے اضلاع میں تعینات رہتے تھے۔ مگر ڈالی نہیں پہنچتی تھی۔ بھیا فاروقی ان کے چھوٹے بھائی تھے اور میرے ہم سن تھے۔ مگر جنگلات میں تھے۔ عمر میں چھوٹے تھے۔ ہماری جوانی میں کمر کی جنت سامان تھے۔ دیکھی ان کا جوانی دیکھو، ہو سن۔ دونوں بھائی فخر خاندان تھے۔ عمر بھر گزارتے رہے مگر آخر میں آرام اپنے شہر میں آ کر ملا۔

پیارے میاں پھوپھی ماں کے اکلوتے بیٹے تھے۔ ماڈرن پڑھے لکھے بگڑے کے ساتھ ساتھ خاندان میں وہ پہلے فرد تھے جنہوں نے بائیسکوپ دیکھا۔ ایک دفعہ یہ [illegible] ایک [illegible] کو دیکھ کر دل بہت بے قابو ہوا۔ مگر میں نے یہ

[illegible] کو سنبھالا اور پھر اُس طرف کا رخ نہیں کیا۔ پیارے میاں آگے ناٹک کے متوالے تھے۔
[illegible] تو اس کے رسیا بن گئے

[illegible] کی بی" دیکھ کر سلوچنا پر مر مٹے ایک روز [illegible] اماں کی سونے کی بالیاں چرا
کر گھر سے نکل گئے اور سیدھے بمبئی پہنچے۔ میاں جانی نے کہا [illegible] دے! اب
[illegible] بمبئی میں ایک فلمی نے انھیں [illegible] سلوچنا [illegible]
[illegible] خود [illegible] ساری جوانی بمبئی میں گزار دی۔ [illegible] اماں کے [illegible]
آنے [illegible] آچکا تھا [illegible] ہاتھ میں تسبیح [illegible] اماں کو بہت روئے [illegible] سب نے کہا
کہ اب [illegible] رہو۔ بولے کہ میاں جانی کی اجازت کے بغیر یہاں کیسے [illegible] میاں
جانی دنیا سے پہلے ہی سدھار چکے تھے۔ اجازت کون دیتا۔ پھر بمبئی جیسے [illegible] لاکھ [illegible]
تھا اور کاٹ [illegible] ہوتے تھے۔ سب نے بہت سمجھایا، نہ مانے [illegible] سو
[illegible] مگر بمبئی [illegible] جانے راستے میں ان پر کیا گزری۔

پیارے میاں [illegible] خاندان کی طرف سے [illegible] کے فسادات میں پہلی [illegible] تھے
میاں نے [illegible] کیے [illegible] تب سے اب تک ہمارے خاندان کے اکثیں افراد کو پیارے
[illegible] ہوئے۔ [illegible] موت [illegible] ہندوستان میں [illegible]
پاکستان [illegible] ان [illegible] کے ہاتھوں [illegible] ہوئے۔ ان [illegible] میں سے [illegible]
[illegible] کے [illegible] الیکشن کے موقع پر [illegible] فاطمہ جناح کی حمایت کرنے کی پاداش میں
[illegible] باقی [illegible] مشرقی پاکستان میں [illegible] افراد میں [illegible] میاں
[illegible] ہیں۔ ہمارے گھرانے کی رحمت سے [illegible] نہیں [illegible] میاں [illegible]
[illegible] جگر کا [illegible] نہیں [illegible] ہے تو [illegible] سے [illegible]
[illegible] رفیق [illegible] شرافت [illegible] میاں سے گزر [illegible] کر سے [illegible]
[illegible] رہ گئے [illegible] وہ [illegible] میاں سے [illegible]

اثر کیا ہو۔ جتنے دن یہاں رہا ہے ایسے دھڑک بائیسکوپ دیکھتا رہا۔ چلنے کے لیے تیار ہوا تو کشمنڈو کی بجائے بمبئی کے لیے بستر باندھا۔ میں نے بمبئی جانے کا سبب پوچھا تو کہا کہ وہاں راجیش کھنہ سے ملوں گا۔ میں نے کہا کہ ابے بے ایمان! راجیش کھنہ کون سا ہی ملمور یا ڈیتی ملمور رہا ہے جو تو اس سے ملنے کے لیے بیتاب ہے۔ مگر اس نے میری ایک کان سنی اور دوسرے کان اڑائی اور بمبئی روانہ ہو گیا۔ بعد میں اس کالنکا سے خیریت کا خط آیا۔ پتا نہیں کن کن راستوں پر بھٹک کر وہ وہاں پہنچا۔

شرافت کو زندہ دیکھ کر خدا کا شکریہ ادا کیا۔ مگر اس کے لچھن دیکھ کر دل خوش نہیں ہوا۔ ویسے میں نے جو کچھ سنا ہے اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ پاکستان میں جا کر ہمارے خاندان کی لڑکیاں زیادہ آزاد ہو گئی ہیں۔ میں تو جس لڑکی کے متعلق سنتا ہوں یہی سنتا ہوں کہ اس نے اپنی مرضی سے شادی کر لی ہے۔ ہمارے خاندان میں تقسیم سے پہلے بس ایک واقعہ ایسا ہوا تھا جو خاندان کو بدنام کر سکتا تھا۔ مگر اسے بھی خوش اسلوبی سے دبا دیا گیا۔ چھوٹی پھوپھی کی چھت پر ایک روز کنکوا آ کے گرا ——— اور تم جانو کہ جس گھر میں کوئی لڑکی جوان ہو رہی ہو اس گھر کی آنگنائی میں روڑے کا گرنا اور چھت پر کنکوے کا ختم ہونا کچھ اچھی علامت نہیں ہے ———

ان دنوں چھوٹی پھوپھی کی بڑی لڑکی خدیجہ فرنکال رہی تھی۔ چھوٹی پھوپھی نے اس واقعے کا ذکر میاں جانی سے آ کر کیا۔ کنکوے کے ساتھ جو رقعہ چھت پر گرا تھا وہ بھی سامنے رکھ دیا۔ میاں جانی آگ بگولا ہو گئے۔ بہت گرجے برسے کہ رضا علی کے بیٹے کی یہ مجال کہ ہماری چھت پر کنکوا اڑاتا ہے۔ مگر جب چھوٹی پھوپھی نے اونچ نیچ سمجھائی تو بیچارے ٹھنڈے پڑ گئے۔ اب اس کے سوا چارہ ہی کیا تھا کہ اس اوباش کے ساتھ دو بول پڑھا دیے جائیں اور لڑکی کو رخصت کر دیا جائے۔ رضا علی صاحب تو خواب میں بھی نہیں سوچ سکتے تھے کہ اس گھر کی بیٹی ان کی بہو بنے گی۔ فوراً نکاح پر رضامند ہو گئے مگر عین وقت پر سوال اٹھایا کہ صیغہ پڑھا جائے گا۔ میاں جانی خون کا سا گھونٹ پی کر رہ گئے مگر یہ کہہ کر ہاں کر دی۔ مگر اس کا نتیجہ کیا ہوا؟ یہی کہ خدیجہ کی اولاد آدھی نیز آدھی بہ

[illegible] ہوں تو دوسرے محرم ہیں سزاوار ہی گزرے۔ مگر جب تو
[illegible] ہی آدھی تہائی آدھی پیٹر ہے اور ہم سب سزاوار ہیں کہ تجربہ ہمارا کھویا ہوا اور
[illegible] ہوا۔ خاندانوں میں یہ خاندان آگے کیسے بچایا جائے گا۔ اب یہ خاندان
[illegible] اور نخوت سے بڑھتے ہوئے بیٹھے ہیں کہ جو ابھی اڑنے پھرنے لگے ہیں اور خاک میں
رلتے ملتے ہیں۔

[illegible] رشتے ہوں کا ماتم دار ہوں۔ اُن دنوں کو جب یہ خاندان برگ و ثمر سے لدا
[illegible] یاد کرتا ہوں اور آدھے پہلوں کا شمار کرتا ہوں جن سے مرنے والوں کے [illegible]
[illegible] کیسے ہیں۔ جن کا نہ دیں میں نہ دنیا ان کو بھی شمار کیا ہے۔ سب کے نام، بچے اور
[illegible] کرتے ہیں۔ حقیقت کی ہے کہ اس وقت کوئی اہل خاندان کس کس میں [illegible] اور کس
[illegible] ہے۔ یہ حیرت بھری چیخیں نہیں بچ دیں گی۔ اپنا کیا اعتبار کہ جبر کے [illegible] ہیں۔
[illegible] ہے۔ اور آنکھ بند ہوا چاہتی ہے۔ تم اس بیہ بخت خاندان کے نئے چشم و چراغ
ہو۔ [illegible] ہیں۔ بھٹکنے ہوؤں کو گزرا جاتے ہیں۔ [illegible] کی سعی کرو تو یہ تمہاری سعادت مندی
ہوگی۔ [illegible] ہے تو شاید ہے ہیں ابھی آیا ہے کہ تنکے بکھر گئے سو بکھر گئے۔ نہ بڑا خاندان بھی کتنے سب
[illegible] گئے۔ مگر کوشش [illegible] خاندان کا فرض ہے۔ اس درماندہ خاندان کے سر و سرے بنو۔ [illegible]
کی [illegible] رکھو۔ اب کہ رشتے کھلنے لگے ہیں۔ دھڑکا بھی ایک پھیرا لگا جاؤ۔ ابھی صورت دکھا جاؤ [illegible]
صورت دکھا جاؤ۔ [illegible] کی [illegible] ہے کہ دشمن کو [illegible] ہاں ہاں اب [illegible] آ۔
[illegible] تمہارے [illegible] کو بھی دیکھ نہیں گئے کہ اس کی [illegible] صورت سے [illegible] کون
[illegible] ہے۔ ایک بات [illegible] پاکستان جا کر اس خاندان میں [illegible] ہوا ہے۔ اس کی [illegible]
[illegible] کی [illegible] ہے۔ [illegible] صورت سے [illegible] جا سکتے۔

یہ [illegible] تم خود پر کر لینا۔ اس ڈھانی پوتے تین سال [illegible]
[illegible] ہے [illegible]

ان کی تفصیل معلوم کر کے مجھے لکھو۔ میں الگ الگ کہاں خط لکھوں۔ ڈاک کتنی تو ہے مگر اتنی مہنگی کہ اب حقیر سا پوسٹ کارڈ لکھتے ہوئے بھی یہ لگتا ہے کہ تار برقی بھیج رہے ہیں۔ یہ کیا سن رہا ہوں کہ خدیجہ کی چھوٹی بیٹی نے شوہر سے خلع لے لیا ہے اور خاندانی منصوبہ بندی کے دفتر میں بھرتی ہو گئی ہے۔ خود تو کام سے گئی، دوسروں کے وظیفہ زوجیت میں کشمکش ڈالتی پھرتی ہے۔ ہاں میاں! شجرہ تو لکھو یار! اب یہ خاندان جو بھی کرے تھوڑا ہے۔ مگر سنتا ہوں کہ دوسرے خاندانوں والے اس سے جل کر رہے ہیں۔ کوئی بتا رہا تھا کہ ابراہیم نے آٹے میں چوری اور چینی میں کرا ایک ورمل بنا لی ہے! اور میاں فیض الدین نے کہ یہاں پھٹے حالوں پھرتے تھے، کالے پیسے سے کوٹھیاں کھڑی کر لی ہیں! میں پوچھتا ہوں کہ کیا پاکستان میں سب ہی خاندانوں کے شجرے کھو گئے؟ عجیب تر العجیب کہ ہم نے دیار ہند میں صدیاں بسر کیں، بیتی کا زمانہ بھی گزارا، دیار کے دن بھی دیکھے۔ اس کی شان کے قربان، حکومتیں بھی کیں، محکوم بھی رہے مگر شجرہ ہر حال میں حرز جان رہا۔ پر اب دھڑا دھڑ لوگوں نے پاکستان میں اپنے شجرے گم کر دیے۔ خیر خوش رہیں۔

کیا کیا لکھوں: لکھنے کو بہت ہے مگر تم اس کم لکھے کو بہت جانو۔ اپنی خیریت بھیجو۔ اللہ کی امان دو۔ رقعہ تمام کرتا ہوں کہ اب نماز کا وقت ہو رہا ہے اور اس کے بعد مقدمے کے ترتیب دینے میں کل سحر پیشی ہے۔ یہ چار سو ستائیسویں پیشی ہے۔ اللہ العزیز خوش اسلوبی سے نجات دی جائے گی۔ شاید میں اسی پیشیوں کے لیے زندہ ہوں ورنہ اب تو ہمارے بوڑھے چچا میں کچھ باقی نہیں رہ گیا ہے۔ حتیٰ کہ جینے کی خواہش بھی باقی نہیں۔ دنیا میں اگر بہت کچھ دیکھا۔ جو نہ دیکھنا تھا وہ بھی دیکھا۔ کہیں جلد کی آنکھ نہ ہو کہ وہ دیکھیں جو دیکھنے کی حسرت العمر سے آرزو ہے۔

تمہارا دور افتادہ چچا

گمنام قربان علی

مورخہ ۲۸ رمضان المبارک ۱۳۹۴ھ

مطابق ۱۵ اکتوبر ۱۹۷۴ء

نیند

"خدا تمہیں دیکھ کر حیران رہ گیا" اے مسلمان تم! تم آ گئے! مگر کیسے؟"

"یہ مت پوچھو کہ کیسے۔ بس میں آ گیا۔"

"خطرہ کی سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر کیا کیسے وہاں سے زندہ بچ کر نکل آئے۔ . . . . یہ تو معجزہ ہے۔"

"ہاں معجزہ ہی سمجھ لیں زندگی تھی کہ نکل آیا۔"

"تعجب اس کے نکل آنے پر خطرہ ہی کو نہیں تھا خود سے بھی تھا۔ میں خود حیران ہوں کہ وہاں سے میں کیسے نکل آیا۔"

خطرہ حیران اسے تھا کہ وہاں سے بچ کر نکلنے والوں میں وہ پہلا شخص تھا جس سے خطرہ کی علامت ہوتی تھی۔ اس کے تصور میں یہ بات نہیں آ رہی تھی کہ وہاں سے کوئی بچ کر کیسے آ سکتا ہے اس مسلمان کو یک ٹک خطرہ سمجھ کر سر سے پیر تک دیکھا۔ "مسلمان تم وہاں سے نکلے کیسے؟"

"میں کیسے نکلا۔ وہ بڑا جرنا۔ اس کا کوئی پتا کہ وہ کیسے ساتھ میں تھی جو بڑی مدد دست

ذ ے۔ مگر پھر اردگرد کی فضا کو دیکھ کر رکا۔ "یار دو لفظوں میں تو سے بیان نہیں کیا جا سکتا
یہ تو پوری داستان ہے۔ تم سنو گے تو تمہارے ہوش اڑ جائیں گے"۔

"ٹھیک کہتے ہو۔ ہمارے تو سن سن کر ہوش اڑ رہے ہیں۔ اور تم نے تو سب کچھ آنکھوں
سے دیکھا ہے"۔

"ہاں نے گھنٹہ سا سن کر، "ہاں سب کچھ آنکھوں سے دیکھا ہے"۔

"بہت بہت ان گنت لفظ سامنے آنکھوں میں گھوم گئے۔ "تم نے خود دیکھا ہے کہ . . .
بس بہت کچھ دیکھا ہے؟"

"کچھ سناؤ"

"ہاں ایک دفعہ کچھ ہی پیارے بس شروع ہوئے تھے۔ لیکن اس نے پھر اپنے آپ کو روکا۔ سامنے
سنا ہے تیرے پاس بہت کچھ ہے۔ مگر یہاں کھڑے کھڑے کیا سناؤں"

"مغفر نے سوچا، پھر پوچھا۔ "سلام کو تم کیا کرتے ہو"؟

"کیا نام کیا جیسے میرے لیے کرنے کو اب ہے کیا"۔

"پھر تم شام کو میری طرف آ جاؤ"۔

"آ جاؤں گا"۔

"اسلم کو فون کر دوں گا۔ وہ بھی آ جائے گا"۔

"اسلم چلی؟ ارے وہ یہیں ہے"۔

"اسے رزق نہ موت اسے کہاں جانا ہے"

"اور زبیدہ کہاں ہے"

"اس کو اسے کوئی بلا لوں گا۔ پھر کچھ رہی"۔

"مغفر نے کو بیٹھ کر تیزی سے نہ کھایا" بیلو سلام۔ یار میں ہوں مغفر یار سلمان آئیں سے
سلمان؟ . . . یار کیا کہہ رہا ہے"۔

"ہاں ہاں یار ۔ وہ آگیا ہے"!

"وہ وہاں سے بچ کر نکل آیا؟ مگر کیسے"؟

"شام کو آؤ اور اس سے خود پوچھ لو"۔

"آؤں گا"

پھر اس نے زبیری کے دفتر فون کیا "ہیلو زبیری۔ جنٹی زبیری صاحب کو بلائیں"۔

... ہیلو زبیری ..... میں ظفر ۔ یہ تمہیں ایک خبر سناؤں"۔۔۔۔

"سناؤ"!

"سلمان آگیا ہے"۔

"سلمان ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ نہیں بے"۔

"ہاں یار وہ نکل آیا ہے"

بہت موٹی گالی کا نکلا۔ پھر کہاں سے وہ"۔

شام کو میری طرف آجاؤ۔ وہ آئے گا"۔

"آجاؤں گا"

شام کو چار دوست یار اکٹھے ہوئے۔ تینوں نے سلمان کو اور سلمان نے ان تینوں کو ایک حیرت سے دیکھا۔ سلمان نے اس کے بچ نکلنے پر پہلے اظہار تعجب کیا، پھر دوست کے حالات پر اظہار افسوس کیا۔ پھر غصہ آگیا۔ لوگوں کو انہوں نے کیسی کیسی اذیتیں دے کر مارا ہے ۔ ۔ ۔ بوڑھوں کو، بچوں کو، عورتوں کو ۔ ۔ ۔ جنٹی ۔ ۔ درندے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

کرنا چاہیئے تھا"۔

"کیا کرتے رہے تھے۔ کیا کیا تھا ہم نے ان کے ساتھ" اسلم غصہ سے چلایا۔

پھر اسلم نے اخباری رپورٹوں کے حوالے سے ان کے مظالم کی تفصیلات سنائیں اور زیدی نے بے تحاشہ اعداد و شمار بیان کر کے اپنی طرف والوں کے استحصال کو ثابت کیا۔ سلمان نے ایک میٹھی جماہی لی۔ ظفر نے اس کی طرف دیکھا۔

"سلمان تمہارا کیا خیال ہے۔ تم بتاؤ"۔

اسلم نے ظفر کے منہ کی بات لپک لی۔ "ہاں سلمان سے پوچھو۔ یہ تو وہاں اتنے عرصے رہا ہے۔ اس نے سارے حالات دیکھے ہیں۔ سلمان تمہارا کیا خیال ہے"

"میرا کیا خیال ہے" وہ سوچ میں پڑ گیا۔

اسے خاموش دیکھ کر ظفر آخر بے چین ہوا۔ اسے ٹہوکا۔ "یار کچھ بولو"

"کیا بولوں"۔

زیدی کی طنزیہ ہنسی ہنسا "کرمٹ منٹ سے ڈر رہا ہے"

"کرمٹ منٹ" وہ زیدی کا منہ تکنے لگا۔

اسلم نے زور دیکر کہا "آخر پتہ تو چلے کہ تم اس بارے میں کیا سوچتے ہو"۔

اس نے اک تذبذب کے ساتھ کہا "یار کچھ سمجھ میں نہیں آتا"۔

ظفر نے برہمی سے اسے دیکھا "پہلے برس جب تم آئے تھے تو تم نے وہاں کے حالات کا تجزیہ کر کر کے میرا دماغ چاٹ لیا تھا۔

وہ ظفر کو تکنے لگا۔ پھر مری ہوئی آواز میں بولا "اس وقت میرا گمان یہی تھا کہ میں نے حقیقت کو سمجھ لیا ہے"۔

"اچھا چھوڑو اس قصے کو" ظفر نے کہا "تم یہ بتاؤ کہ وہاں ہوا کیا"۔

"ہاں یہ میں بتا سکتا ہوں" اس نے مستعدی سے کہا۔

"میں نے وہاں بہت کچھ دیکھا ہے۔ میں اسے سناؤں تو تمہارے رونگٹے کھڑے ہو جائیں"
کہہ کر وہ یہ کہہ کر ایسے چپ ہوا جیسے کوئی لمبی داستان سنانے کی تیاری کر رہا ہے۔ تینوں یار
ہمہ تن گوش ہو بیٹھے۔ انتظار کرتے رہے کہ اب شروع ہو اور اب شروع ہو۔ مگر وہ بالکل چپ
تھا۔ جب وہ کچھ نہ بولا تو ظفر نے ٹہوکا دیا۔ "یار تم تو چپ ہو گئے۔"

"ہاں یار" ۔ اس نے سست سے لہجہ میں کہا "کچھ یاد نہیں آ رہا۔"

سلم اور زبیری دونوں نے اسے غصیلی نظروں سے دیکھا اور پھر اس سے بے تعلق ہو کر
ایک دوسرے سے بحث کرنے لگے۔

بحث گرم ہوتی چلی گئی۔ طنز و تعریض، غصہ، ناشائستہ کلمہ، کبھی ادھر سے کبھی ادھر سے
بیچ بیچ میں ظفر کی طرف سے کوئی بھرپور گالی کبھی اس طرف والوں کے لیے کبھی اس طرف والوں کے
لیے۔ انتظار، دوستوں کا منہ تکنا۔ پھر اس کے پپوٹے بھاری ہونے لگے۔ ایک دو دفعہ اونگھ گیا۔ پھر
فوراً ہی وہ مستعد ہو بیٹھا اور ایک ایک بات غور سے سننے لگا۔ مگر تھوڑی ہی دیر میں اس کے
پپوٹے پھر بھاری ہو گئے۔ اور اس کی آنکھیں مندتی چلی گئیں۔

اس نے بیچ میں ایک مرتبہ چونک کر آنکھیں کھولیں۔

"حرامزادے۔ سامراجی کتے" ——— اسلم نے زور سے میز پر مکا مارا

"سب سالے خدا کے تھے۔ ہندوستان کے ایجنٹ" ۔ زبیری نے غصے سے کہا۔ سلم نے
دونوں کو نیند بھری نظروں سے دیکھا اور پھر سو گیا۔

آخر وہ اس وقت اٹھا جب چائے سامنے آ گئی اور ظفر نے اسے ٹہوکا "سلام چائے پیو"۔
اس نے بڑا سا منہ کھولا۔ مستعد ہو کر نظروں سے دوستوں کو دیکھا اور مستعد ہو
بیٹھا۔ آنکھوں پر زور سے انگلیاں پھیریں۔ پھر چائے کا گھونٹ لیا۔ چائے کے ساتھ ساتھ اس کی
نیند غائب ہوتی چلی گئی۔ چائے نے اسے تازہ دم کر دیا تھا۔ جیسے اس کے دل و دماغ کے دریچے
کھلتے چلے جا رہے ہوں۔ کہنے لگا۔

"اپنے سونے پر ان دنوں کا ایک واقعہ یاد آگیا۔ اس رات ایسا ہوا کہ میں بالکل نہیں سو سکا۔"
یہ کہتے کہتے کئی دہشت بھرے منظر تیزی سے اس کے تصور میں ابھرے اور ایک غیر انسانی سی چیخ
اس کے دماغ میں گونج گئی۔

"یہ کس رات کا ذکر ہے۔ زوال ہو چکا تھا؟" اسلم نے سوال کیا۔ اس نے سوچا پھر کہا "ٹھیک
یاد نہیں کہ وہ کونسی رات تھی۔ ویسے وہ سب راتیں ایک سی تھیں۔ ہوا یہ کہ . . . ." یہ کہتے
کہتے وہ چپ ہو گیا۔ اسلم زبیری، ظفر تینوں اس کی طرف متوجہ تھے۔ انہیں اپنی طرف متوجہ دیکھ
کر وہ سٹپٹایا۔ بولا "کی بات ذہن سے اتر گئی۔ بہر حال اس کے بعد میں رات بھر نہ سو سکا۔
رکا پھر بولا "اور پھر اس کے بعد تو یہ ہوا کہ سونا نصیب ہی نہیں ہوا۔ شاید پھر سویا ہی
نہیں ——— یا شاید کبھی سو لیا ہوں . . ."

اسلم زبیری، ظفر تینوں نے بے دلی سے اس کی بات سنی۔ پھر وہ آپس میں گتھ گئے اور وہی بحث
کرنے لگے کہ ادھر والوں نے ان کا استحصال کیا۔ یا ادھر والوں نے غداری کی۔ اور وہ بیٹھا بیٹھا یہ
یاد کرنے کی کوشش کرنے لگا کہ ان راتوں میں وہ کسی رات سویا تھا یا نہیں سویا تھا۔ اسے کچھ یاد
نہ آیا۔ وہ یہاں آنے کے بعد یہاں آنے کے بعد کا بھی سونے کا حساب وہ ٹھیک نہیں لگا سکا۔
اس حساب سے تھک کر وہ اسلم زبیری اور ظفر کی بحث پر متوجہ ہو گیا۔ سنتا رہا۔ سنتے
سنتے اس نے ایک جماہی لی اور خود آمیز آنکھوں سے ظفر کو دیکھتے ہوئے کہا۔ "یار مجھے نیند
آ رہی ہے۔"

ظفر غضب ناک ہو کر اسے دیکھنے لگا۔ پھر مروت میں کہا۔ "تو پھر سو جاؤ۔"

"یہ بار بار جماہی لینا جماہی نہیں اس نے بند ہوتی آنکھوں کے ساتھ بیٹھے بیٹھے کہا۔
کہا۔ آگے کھسک کر سر صوفے کی نشست پر ٹکایا۔ اور پیر میز پر پھیلا لئے۔ اس طرح کہ اس
کی ایک خستہ حال جوتی اسلم کے مقابل تھی اور دوسری جوتی کی نوک زبیری کے روبرو۔ اور وہ
خراٹے لینے لگا۔

کچھوے

وہ دریا کا گرجنا بند ہو گیا تھا اس نے کچھوؤں کو اونچی آوازوں سے بولتے سنا تھا۔ وہ دیکھیں
اور چپ ہو گیا۔ سنتا رہا اور چپ رہا۔ پھر ان کے پیچھے سے اس درنگرے پر نگرہ بیلوں سے دور تک
نشان تک پیڑ کے نیچے سمادھی لگا کر بیٹھ گیا۔ اور کچھوؤں کے ایک جوڑے پر نظر جمائے جمائے مسکایا اور مرحوم
کی آنکھ بیلوں کے بعد وہ اچھول دوست کے کے میرا اچھوں کے پھول پر دو روشنی ماں، پھولوں کا مسا

اور مرحوم جب یہ ایوان شانوں یا اور آنکھیں ہوں دیں فسدان آنکھیں موند سے بیٹھا رہا۔

دنوں بعد جب دنوں کے سنگھی سندر سمندر اور گوپال اس کے پاس آئے تو سنا کہ دریا کو
ہم دیکھ رہے ہیں۔"

دریا کا کہ پیشانی مورتی بنا بیٹھا رہا۔ ان سے کچھ نہیں بولا۔ کچھ دیر بعد اس کی آنکھیں کھل گئیں
مدت سے کچھ نہیں بولا۔ جب وہ بہت بول رہے تھے تو وہ بولا۔ جب بولا تو سنا۔ جب بولا تو
درسد مدد بولا "سوچ رہے تھے کہا اور نہوں نے کیا۔ سوچ رہا تھا کہ کیا کہا جائے
تمہارے پاس نہیں ہے۔ وہ سمد کو کہا تھا کہ یہ کرو اور یہ مت کرو۔ جب تمہارے پاس

آئے گی وہ ہم کریں گے۔ ہے ودیا ساگر! اب سب بھکشو وہی کرتے ہیں جو ان کے جی میں آتی ہے اور ان کا جی ترشنا کے جنگل میں ہے۔ گھاس کا بستر انہوں نے چھوڑ دیا۔ اب وہ کھاٹ پہ سوتے ہیں درجا جم پہ بیٹھتے ہیں۔ ہے گنی ہے گیانی تو کیوں نہیں بولتا۔"

ودیا ساگر نے آخر کو آنکھیں کھولیں، سندر سمدر اور گوپال کو غور سے دیکھا، پوچھا "بندھوؤ، تم نے طوطے کی جاتک سنی ہے؟"

"نہیں"

"تو پھر سنو۔" ودیا ساگر سنانے لگا "بیتے سمے کی بات ہے کہ بنارس میں برہم دت کا راج تھا اور ہمارے بدھ دیو جی نے طوطے کے روپ میں جنم لیا تھا۔ ان کا ایک چھوٹا بھائی تھا۔ دونوں چھوٹے سے تھے کہ ایک چڑی مار نے انہیں پکڑا اور بنارس کے ایک برہمن کے ہاتھ بیچ دیا۔ برہمن نے دونوں طوطوں کو ایسے پالا جیسے اولاد کو پالتے ہیں ایک بار برہمن کو پردیس جانا پڑا۔ جاتے ہوئے طوطوں سے کہہ گیا کہ مٹھو ڈنگ اپنی ماما کا دھیان رکھنا۔

برہمن کے جانے کے بعد وہ ماری کتل کھیلی۔ چھوٹے طوطے نے اسے ٹوکنے کے لئے پرتوے بڑے نے کہا کہ بندھو تو بیچ میں مت بول، پر چھوٹا نہ مانا اور ماری کو ٹوک بیٹھا۔ اس چانڈال ماری نے غصہ میں بن کر کہا کہ چپ سب میں کوئی باپ نہیں کہ دوسرے کی تو نے ٹوک دیا اچھا کیا۔ باہر آ تجھے پیار کروں۔ وہ بھولا باہر آ گیا۔ ماری نے جھٹ اس کی گردن مروڑ دی۔

جب دونوں بھائی برہمن واپس آیا تو اس نے بڑے سے پوچھا کہ میاں مٹھو تمہاری ماما نے میرے سمے کیا کیا۔ طوطا بولا کہ مہاراج جہاں کھوٹ ہو وہاں بدھیمان چپ رہتے ہیں کہ ایسی اوستھا میں جو سنے بیچ بیان کا کھٹکا ہے۔

طوطے نے یہ کہہ کر جی میں سوچا کہ جہاں بول نہیں سکتے وہاں جینا اچھا نہیں ہے۔ وہاں چپ جہاں بول سکے۔ پر یہ کہہ کر برہمن سے کہا کہ مہاراج ڈھنڈوت ہم چلے برہمن نے پوچھا کہ میاں مٹھو کہاں چلے۔ بولا کہ وہاں جہاں بول سکیں۔ یہ کہہ کر بدھیمنتو جی بنارس کی بکھری بستی کو چھوڑ جنگل

کی آواز آئی:

یہ جاتک سن کر ودیا ساگر شاں کے پیڑ کے نیچے سے اٹھ آگے چل پڑا۔ چلتا رہا، چلتا رہا کاشی کوسل جا کر ایک نرجن بن میں داخل کیا۔ سندر سمدر اور گوپال بھی سرج مرج کھیتے پیچھے پیچھے وہاں پہنچے۔

ودیا ساگر تین رات بیراس مارے آنکھیں موندے لیے کھائے پیے بیٹھا رہا۔ چوتھے دن سندر سمدر اور گوپال اپنے اپنے بھکشا پاتر لے کر اس بن سے نکلے، دشا م پڑے بھرے بھکشا پاتروں کے ساتھ واپس آئے۔ ودیا ساگر کے پاس بیٹھ کر بولے کہ "ہے ودیا ساگر، کیا تتھ گت نے نہیں کہا تھا کہ پیٹ بھرنے کے لیے کھاؤ اور پیاس بجھانے کے لیے پیو؟"

یہ سن کر ودیا ساگر نے آنکھیں کھولیں جو سامنے رکھا تھا اسے کھایا ایسے جیسے اس میں کوئی سواد ہو اور زندگی کا زہر حل پیا ایسے جیسے وہ گرم پانی ہو۔ پھر کہا کہ مٹی کو مٹی میں ارپن کیا۔

سندر سمدر نے یہ موقعہ اچھا جانا اور کہنے لگا کہ "ہے ودیا ساگر، بھکشو ست پنتھ سے پتہ گئے ہیں۔ تتھ گت کے بتائے ہوئے نیموں کا پالن نہیں کرتے۔ پیڑ کی چھاؤں چھوڑ دی۔ جھنڈوں تلے اور پیڑ کی نیچے آرام کرتے ہیں۔ ایک سنگھ کے نو کتنے سنگھ بن گئے۔ اور کتنی منڈلیاں پیدا ہو گئیں۔ ہر منڈلی دوسری منڈلی کی جان کی بیری ہے۔ تو پیٹ میں دوا نہیں سکتا۔ سے کہ تو ہمارے پہنچ گئی اور گیانی ہے۔"

ودیا ساگر بولا کہ "ہے سندر سمدر تو نے بلنا کی جاتک سنی ہے؟"

"نہیں"

"تو سن۔ اگلے جنم کی بات ہے کہ جنم میں میں راجہ برہم دت براجتا تھا۔ وہ سمدر بودھ ستو دوبارہ جنم کے جنم میں جنگل میں باس کرتے تھے۔ ایک پیڑ کی جڑ میں ایک سنہ گھونسلہ بنایا اور اس میں رہنے لگے۔ ایک بار بہت درشٹ ہوئی۔ ایک نیولا بلیاں مرا کہیں سے آیا۔ وہ اسی پیڑ پر بنا کے گھونسلے کے باہر بیٹھ گیا۔ پرندے بھی وہ نیولا سے بھیگ رہا تھا۔ بلیا بولی

کرتا ہے منوں۔ ویسے تو تو آدمی کی بہت نقالی کرتا ہے مگر گھر بنانے میں اس کی نقالی کیوں نہیں کرتا۔ آج تیرا گھر ہوتا تو دشا سے یہ تیری دُردشا کیوں ہوتی۔" بندر بولا کہ "ہماری بینا میں نقل کرنا ہو پر عقل نہیں۔" مگر پھر بندر نے یہ کہنے کے بعد سوچا کہ بینا اپنے گھر میں بیٹھی باتیں بنا رہی ہے اس کا گھر نہ ہوا اور میری دُرگت بھیگے۔ پھر دیکھوں کیسے باتیں بناتی ہے یہ سوچ کے اس نے بینا کے گھونسلہ کو کھسوٹ ڈالا۔ بدھیستو جی اس موسلا دھار مینہ میں گھر سے بے گھر ہو گئے۔ انہوں نے ایک گاتھا پڑھی جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہر ایرا غیرا کو نصیحت کرنا سخت میں مصیبت مول لینا ہے یہ گاتھا پڑھتے وہ اس جنگل سے بھیگتے ہوئے دوسرے جنگل کی اور اڑ گئے۔"

دیا ساگر نے یہ جاتک سن کر ٹھنڈا سانس بھرا اور کہا کہ بدھ دیو جی نے بندروں کے ساتھ کیا کیا اور بندروں نے بدھ دیو جی کے ساتھ کیا کیا؟ پھر یہ جاتک سنائی۔

"بنارس کے راج سنگھ سن پر برہم دت براجتا تھا اور بدھ دیو جی نے بندر کا جنم لے کے جنگل بسایا ہوا تھا بڑے ہو کے وہ ایک موٹے تازے بندر ہوئے اور راجہ کے آموں کے باغ میں رہنے والے بندروں کے رجیمنٹ ایک بڑے آموں کی رت میں راجہ باغ میں آیا اور بندروں کو دیکھ کر بہت کلیس کہ وہ آموں کا ناش کر رہے ہیں۔ اپنے پارشدوں سے کہا کہ باغ کے گرد گہرا ڈالو اور ایسے تیر چلاؤ کہ کوئی بندر بچ کے نہ جائے۔

بندروں نے یہ بات سن لی۔ بدھیستو کے پاس گئے اور پوچھا کہ ہے بندر راجہ! اب کیا کیا کرنا چاہیے۔ بدھیستو جی نے کہا کہ چنتا مت کرو۔ اکیلی اپائے کرتا ہوں۔ یہ کہہ کے وہ ایک ایسے پہاڑ پر چڑھے جس کی ٹہنیاں گنگا کے پاٹ پر دور تک پھیلی ہوئی تھیں۔ پاٹ پر پھیلی ہوئی آخری ٹہنی سے دوسرے کنارے تک جتنا گنگا کے فاصلہ پایا اور اس ناپ کا ایک بانس توڑ دیا بیل کی ایک چھال سے باندھ پاٹ کے اوپر سے آم کی ٹہنی تک لانے کا جتن کیا۔ پھر ناپ میں تھوڑی سی چوک ہو گئی۔ بانس اور ٹہنی کے بیچ میں کے دو ہاتھ برابر فاصلہ رہ گیا۔ بدھیستو جی نے کہا کہ کیا بانس کے کونے کے ساتھ اپنی ایک ٹانگ باندھی اور اگلے ہاتھوں سے آم کی ٹہنی پکڑ لی۔

[illegible] سے کہا کہ "[illegible] بل بن گیا ہوں۔ تم میرے اوپر سے ہو کے بانس پر جاؤ۔ بانس پر سے گنگا پار کود جاؤ۔"

[illegible] گرو ہونے [illegible] پنڈت جی کی [illegible] سے [illegible] ہو گئے۔ [illegible] کھو [illegible] پنڈت [illegible] کی [illegible] جنم کا جنم [illegible] تھا۔ اس نے سوچا کہ کیوں نہ [illegible] جنم [illegible] کا کام تمام کر دیا جائے۔ وہ اس [illegible] سے پنڈت جی کی [illegible] کود کر وہ اوجھل ہو گئے۔

راجہ یہ سب [illegible] سے پنڈت جی کو اوپر سے [illegible] گنگا میں [illegible] کہا [illegible] پنڈت جی کے [illegible] پر جانے [illegible] کیا گیا۔ پنڈت جی بولے کہ [illegible] راجہ کو چاہیے کہ پرجا کو [illegible] ہونے دے [illegible] کے کارن [illegible] پنڈت [illegible] کہہ کے پنڈت جی نے آخری [illegible] جنم سے دوسرے جنم میں چلے گئے۔"

[illegible] نے [illegible] کر دیا۔ انہوں نے [illegible] کا [illegible] نے [illegible] کتنے جنم [illegible] کیسے کیسے دکھ [illegible] ہر جنم میں [illegible] پیدا [illegible] دشمنی گت کے لیے کتنے [illegible] پیدا کرتے رہے۔ سندر سمہ نے پوچھا:

"جب [illegible] پنڈت [illegible] کا کچھ [illegible] نہیں تھی۔"

"[illegible] تھا۔" [illegible] گریا نے [illegible]۔

"[illegible] کیوں [illegible]؟" گریا نے پوچھا۔

"جب [illegible] سکتی ہے تو [illegible] کیوں [illegible] سکتا۔"

"سندر سمہ کو کیا ہوئی؟ بکری کیوں ہنسی اور کیوں روئی؟"

ودیا ساگر نے جو یہ بیں ایک جاتک سنائی ہے سنتو بیتے سمے کی بات ہے کہ بنارس میں برہم دت کا راج تھا۔ ایک برہمن نے کہ ویدوں کی ودیا میں رچا بسا تھا مردوں کو بھوجن دینے کے لیے ایک بکری خریدی۔ بکری کو اشنان کرا کے گلے میں گجرا ڈالا۔ بکری اپنے بھینٹ کی یہ تیاری دیکھ کے پہلے ہنسی، پھر روئی۔ برہمن نے پوچھا کہ "بکری تو ہنسی کیوں اور روئی کیوں" بکری بولی کہ "اے برہمن، گئے جنم میں میں بھی برہمن تھی اور میں بھی ویدوں کی ودیا میں پگی ہوئی تھی۔ میں نے بھی ایک بار مردوں کو بھوجن دینے کے لیے ایک بکری لی تھی اور اس کا گلا کاٹا تھا۔ پر ایک بار بکری کا گلا کاٹنے کے بدلے میں میرا گلا پانچ سو بار کاٹا گیا۔ آج پانچ سو بکریوں بار میرے گلے پر چھری پھیرے گی۔ میں یہ دھیان کر کے ہنسی کہ آج پانچ بار میرا گلا کٹ رہا ہے اس کے بعد اس دکھ سے میرا نت راہو جائے گا۔ اور میں یہ دھیان کر کے روئی کہ میرا گلا کاٹنے کے بدلے میں اب تجھے پانچ سو بار گلا کٹانا پڑے گا۔"

برہمن بولا کہ "اے بکری تو ڈر سے مت میں تیرا گلا نہیں کاٹوں گا۔"

بکری زور سے ہنسی اور بولی کہ "مجھ بکری کا گلا تو کٹنا ہی ہے تیرے ہاتھوں نہیں کٹے گا تو کسی اور کے ہاتھوں کٹے گا۔"

برہمن نے بکری کی ہنسی ان سنی کی۔ اسے آزاد کیا اور چیلوں سے کہا کہ دکھشنا کی رکھشا کرو۔ چیلوں نے اس کی بہت رکھشا کی پر ہونی ہو کر رہی۔ اس بکری نے چرتے چرتے ایک پیڑ کی چھنی پر منہ مارا۔ وہ پیڑ اس پر گرا اور وہ وہیں ڈھیر ہو گئی۔

یہ سنتو اب سنو کہ اسی پیڑ کے ہر ہر ایک ستہ پر ایک رشی تھا۔ یہ بدھ ستو جی تھے جنہوں نے ترشنا کے روپ میں جنم لیا تھا۔ انہوں نے ترشنا کا جنم چھوڑا۔ اور ہوا کے پنکھ آسن جما کے بیٹھے۔ جنتا نے یہ دیکھا اچنبھا کیا اور اکٹھی ہونے لگی۔ بدھ ستو جی نے اس گھڑی ایک منگل گاتھا پاٹھ کی جس کا مطلب یہ ہے۔ کہ پرشو ہنسا کا نت دیکھو جو دوسرے کا گلا کاٹے گا ایک دن اس کا بھی گلا کاٹا جائے گا۔"

سندر سمندر گوپال نے یہ بات دھیان سے سنی اور پھر اس سے سر جھکایا۔ مگر پھر سندر سمندر بولا کہ "اے گیانی یہ سوال جو کل کا ہے کیا دیوداسی بھی دیوجی کا بھائی نہیں تھا؟"

"دوارکا ساگر بولا۔ اے سندر سمندر یہ پرشن مت کر نہیں تو میں پھر پیچھے ہنسوں گا اور پھر روؤں گا۔"

"اے گیانی تو کیوں ہنسے گا اور کیوں روئے گا؟"

"میں یہ بات کہہ چکا ہوں گا کہ دیوداسی جو اس دیوجی کا بھائی تھا اور یہ دھیان کر کے روؤں گا کہ وہ بھکشو بھی تھا۔"

سندر سمندر یہ سن کر رویا اور بولا کہ "اے پرمیشور بھکشو کیسے ہو گئے ہیں؟"

"دوارکا ساگر نے سندر سمندر کو گلے لگا کر کہا "اے سندر سمندر یہ مت پوچھ۔"

"کیوں نہ پوچھوں؟"

"مت پوچھ۔ کبھی یہ بھی ہوتا ہے کہ برائی کا کھنڈن کرتے کرتے انت میں ہمیں پاپ ہی آیا دکھائی دیتا ہے۔"

"یہ کیسے؟"

"یہ ایسے کہ بنارس کے راجہ برہمدت کی رانی کسی دوسرے مرد سے مل گئی۔ جس سے پرچھ گھڑی تو میں نے کہا کہ میں کسی پرائے سے ملی ہوں تو میں مرنے کے بعد چڑیل بن جاؤں اور میرا منہ گھوڑی کا ہو جائے اور اب ہوا کہ رانی مر کے پیچ چڑیل بن گئی اور اس کا منہ گھوڑی کا سا ہو گیا۔ وہ ایک بن میں جا کے ایک کنوئیں میں رہنے لگی۔ آنے جانے کو کپڑتی اور کھا پیتی۔ ایک دن ایک برہمن کشید سے دوارکا پر پیشہ کر کے آ رہا تھا۔ چڑیل اسے کر پہ دکھے اپنی کنوئیں میں سے گھسی پر برہمن جوان تھا جب انگ سے انگ ملا تو چڑیل گر گئی کنوئیں میں سے جا کے اس سے لپٹنے لگی۔ برہمن دو خون تھا پر جوان بھی تو تھا۔ دوارکا اپنی جگہ جو تھی اپنی جگہ۔ وہ بھی گر گیا۔ جو جوانی کی اور بھوگ کا اس بھوگ سے چڑیل کو گرہ ہو گئی۔ نو مہینے بعد اس نے جنا۔ یہ دو سندر

بس میرے بدھ دیو مہاراج تھے۔ جنہوں نے اب کی بار چوہڑے کے بھیس میں جنم لیا تھا۔

پدھیستو جی نے بہت ہوکے باپ کو چوہڑے کے چنگل سے نکالنے اور منش جاتی کے بچ جانے کی خاطر چوہڑے نے کہا میرے دل تو نے منش جاتی کے بچ جانے کی خاطر اپنی جان دے دی تو اپنی جان کی بات سن لے کہ چوہڑوں کے بیچ گزارہ کرنا بڑا ہے آدمی کے ساتھ گزارہ کرنا کتنا کام ہے میں تجھے ایک ٹوٹکا بتاتی ہوں جو اس دنیا میں تیرے کام آئے گا۔ اس ٹوٹکے سے تو آدمی کے پاؤں کے نشان بارہ کوس تک دکھا سکتا ہے۔

پھر جب سے یہ ٹوٹکا لے کے پوت بنارس پہنچا اور اپنا گن بتا کے راجہ کے دربار میں چاکری کرنی۔ دربار یوں نے یہ دیکھ کے کہ چھوکرا اور راجہ سے کہا کہ مہاراج پرکھنے تو پہلے کہ اس آدمی کے پاس یہ گن ہے بھی یا نہیں۔ راجہ نے اس کی پرکھ کے لیے کہا کہ خزانے کا مال چوری کر اور دربار کے ایک تالاب میں ڈبو دیا۔ دوسرے دن شور مچا کہ خزانے میں چوری ہو گئی پدھیستو جی سے کہا کہ چوری کا پتا لگاؤ۔ پدھیستو جی نے جھٹ پٹ پاؤں کے نشان دیکھے اور تالاب سے مال برآمد کر دیا۔

راجہ نے کہا کہ تو نے چور کا پتا نہ بتایا۔ پدھیستو جی نے کہا کہ مہاراج مال مل گیا چور کا پتا پوچھ کے کیا کرو گے۔ راجہ نے کہا کہ چور کا پتا بتا۔ پدھیستو جی نے کہا کہ سنیے راجہ میں ایک کہانی سناتا ہوں تو پدھیستو ہے جان لے گا کہ اس کا ارتھ کیا ہے۔ ایک ترنگا منگا میں شمشان کو لے جاتے ہوئے ڈوبنے لگا۔ اس کی جان دو واح سے۔ دیکھ تو چیونٹی کو سوئی تم تو ڈوب رہے ہو۔ مجھے بانہہ کی بجائے کوئی تنکا دو کہ میں سہارا لے کر باہر آ جاؤں۔ کچھ دیر بعد آیا تو اور تمہارے لیے بہت بات کہتے ہوئے بولا کہ اری کھاگوں جڑی میں باری کیا بچاؤں اور کیا دوں۔ میں چوہے پھنکار دست دیتا ہے اور میری مٹی میں جان ڈالتا ہے مجھے مار رہا ہے۔ اس نے ایک کانٹا چبھو کر میں کا۔ دیتے ہوئے کہ چوہے نے تنکا دے کر میری جان بچا لی۔

پنڈت جی نے یہ سن کے کہا کہ مہاراج ۔ یہ بھی پرجا کے لیے پانی سمان ہے اگر پانی ہاری جان لیوا بن جائے تو پرجا کہاں جائے۔

راجہ نے کہانی سنی پر اسے چین نہ آیا بولا کہ یہ کہانی اچھی تھی پر میں تجھ سے چوری کی پرچھتا ہوں وہ بتا۔

پنڈت جی نے کہا کہ مہاراج جو میں کہتا ہوں وہ کان لگا کے سنو اور سمجھو۔ انہوں نے یہ کہانی سنائی بنارس میں ایک گدھا رہتا تھا۔ وہ روز نگر سے نکل کے جنگل جاتا اور اپنے برتن بھانڈوں کے لیے مٹی کھود کے لاتا۔ ایک دن اس مٹی کھودنے کے لیے ایک گدھا بن گیا تھا۔ ایک دن اس گدھے میں آئے کے مٹی کھود رہا تھا کہ مٹی چل پڑی اور اوپر سے ایک تودہ اس پر گر پڑا۔ بیچارے کا سر پھٹ گیا۔ وہ جیا اور یہ کتھا پرچلت ہے کہ جس دھرتی سے کونپل پھوٹتی ہے اور جیو کو جیون ملتا ہے اسی دھرتی نے اپنے پیل دار جو میرا پاؤں مارنے وہی میرا جان لیوا بن گیا۔ اور پنڈت جی نے کہا کہ مہاراج راجہ پرجا کے لیے دھرتی سمان ہے۔ وہ پرجا کو پالتا ہے۔ پر جب پرجا کو ستانے لگے تو پرجا کہاں جائے۔

راجہ نے کہانی سنی اور کہا کہ کہانی میری بات کا جواب نہیں تو چور ٹھہرا اور میرے سامنے سے جا۔ پنڈت جی نے کہا مہاراج بنارس کے نگر میں ایک جنا تھا۔ ایک بار وہ بہت بیمار ہوا۔ اس کی بیوی دوشالی کو جان کے لالے پڑ گئے۔ وہ چلاتی تھی اور کہتی تھی کہ جس جات سے ان گنت برہمنوں کو سکت ملتی ہے اسی جات نے میری سکت چھین لی۔ اور سے مہاراج راجہ پرجا کے لیے جات سمان ہے وہ اس کی پوک اور کرنی سے دھرتی دیتا ہے۔ پر گر راجہ ہی پرجا کا جات چھین لے تو پرجا کہاں جائے۔

راجہ نے پنڈت جی کی ایک کان سنی اور دوسرے کان اڑائی کہا کہ منہ مجھے کہانیوں پہ مت ٹرخا۔

جو یہ بات پنڈت جی نے راجہ سے کہی مہاراج ہمارے پاس ایک پنڈت تھا۔ اس کی بہت سی کتابیں ان کے پاس تھیں بہت سی پڑھتے تھے۔ یہ کرتی تھیں۔ ایک بار وہ کسی نمبیوں سے ایک دوسرے سے گتھم گتھا ہو گئے۔ بال نکلے گئے۔ یہ دیکھ کے ایک چڑیا بالائی کو پنجے میں لے اڑی جس تدبیر سے تھیں ان کی بھی وہی سب جھگڑے پڑنے سے تیرا پاؤں بار بار کھٹا ہوا جان لیوا بن گیا اور

ہے مہاراج جس پرکار سپیرا چڑیوں کو شرن دیتا ہے اسی پرکار راجہ پرجا کو شرن دیتا ہے۔ پرگر شرن دینے والا ہی چور بن جائے تو چڑیاں کہاں جائیں۔

وہ مورکھ راجہ اس پر بھی کچھ نہ سمجھا۔ وہی مرنے کی ایک ٹانگ کہ چور کا نام بتا۔ بدھیستو جی نے ہار کے کہا کہ اچھا سب پرجا کو اکٹھا کرو۔ پھر میں چور کا نام بتاؤں گا۔ راجہ نے ڈونڈی پٹوا کے ساری پرجا کو اکٹھا کر لیا۔ تب بدھیستو جی نے اونچی آواز سے کہا کہ سب بنارس نگر کے باسیو کان لگا کے سنو اور دھیان دو۔ جس دھرتی میں تم نے اپنا دھن دبا رکھا ہے اسی دھرتی نے تمہارا دھن موس لیا۔

لوگ یہ سن کے چونکے۔ انہوں نے تاڑ لیا کہ بدھیستو جی نے کیا کہا وہ راجہ پر پل پڑے۔ پھر اسے ہٹا کے بدھیستو جی کو راج سنگھاسن پہ بٹھایا اور ان کی جے بولی۔

یہ سنتے سنتے سندر سمدر اور گوپال دونوں نے اتساہ سے تتھاگت کی جے بولی۔ ودیا ساگر نے دونوں کو دیکھا یہ جاننے کے لیے کہ ان میں پوچھنے کی چیٹک ابھی تک ہے یا جاتی رہی۔ پھر کہا کہ بھگشوؤ بتانے والا میں تمہیں سب کچھ بتا کے پرلوک کو سدھارا ہے سو اب کسی سے مت پوچھو اور اب پنا دیا آپ بنو کہ امی تابھ نے سدھارتے سمے آنند سے یہی کہا تھا۔

سندر سمدر اور گوپال دونوں تتھاگت کے سدھارنے کا دھیان کر کے دکھی ہوئے اور یوں کہ جس دیئے نے جگ میں جوت جگائی تھی وہ ہمیں ڈگر دکھاتی تھی۔ وہ دیا بجھ گیا۔ اب سرسٹی میں اندھکار ہے ہم اپنے دلوں کے دھندلے اجالوں میں بھٹکتے ہیں۔ اندھیری چل رہی ہے اور اندھکار بڑھتا جا رہا ہے۔ ہمارے ٹھٹھرتے دلوں کی لو مندی ہوتی جا رہی ہے۔

ودیا ساگر نے انہیں ٹوکا اور کہا کہ سنو تم امی تابھ کے لیے کیسی بات دھیان میں لاتے ہو۔ وہ تو امر جوتی ہیں وہ کیسے بجھ سکتے ہیں۔

یہ سن کر سندر سمدر اور گوپال دونوں اپنی چوک پر پچھتائے۔ ایک شردھا کے ساتھ امی تابھ کو دھیان میں لائے۔ دھرتی سے اتنے تک انہوں نے ایک جالا پھیلا دیکھا۔ ان کی دیہی کانپنے لگی اور آنکھوں میں آنسو امنڈ آئے۔ ودیا ساگر کے سنگ مل کر انہوں نے پرارتھنا کی کہ ہم بھگشو تتھاگت

امی تابھ کی پرستش کرتے ہیں جو دیوستھان میں باس کرتے ہیں۔ جہاں ہر سمے ان پر سوگند ہنت بھکشو
پرستش میں ہے آتما روپی ہے ہمارے شاکیہ منی ہے دویا کے ساگر ہے امی تابھ۔ تم کو شمان کے
ساتھ پاتے ہیں تم ہمارے استھان میں آگے باس کرو اور ہمارے انمر جوت جگاؤ۔"

پھر وہ چپ ہو گئے۔ پر آنسوؤں کی گنگا دیر تک بہتی رہی۔ پھر انہوں نے ان دنوں کو یاد کیا جب
امی تابھ ان کے پاس موجود تھے اور نگر نگر ڈگر ڈگر کیا بستی کیا جنگل سب جگہ اجالا پھیلا تھا۔ دویا ساگر بولا "ان
دنوں امی تابھ کے ساتھ رات رات بھر چلتے تھے۔ اندھیری راتوں میں گھنے بنوں سے گزرتے تھے
پر کبھی مجھے یہ نہیں لگا کہ اندھیرے میں چل رہا ہوں۔ ڈگر ایسے دکھائی دیتی تھی جیسے پورنماشی کا چاند نکلا
ہو۔ ہر پیڑ پودے، پھول پتے جانور پری دھرتی اور سارا سنسار اجیارا ہے اور امی تابھ کی جے
دھنی گرنتھ ہے۔

گوپال سنتے سنتے ان دنوں کو دھیان میں لایا۔ کہنے لگا: "سنتو ان دنوں ہم کتنا چلتے تھے نہ دن چلتے
ہیں نہ رات۔ کبھی کبھی جنگلوں میں کبھی پہاڑوں پر اور کبھی بھکشا پاتر لئے نگر نگر گلی گلی۔"

سنتو رسمارتھ سے نرت آتما میں آگیا دکھ سے بولا "اب بھکشوؤں نے چلنا چھوڑ دیا۔ ان کے
پاؤں تھک گئے ہیں، شریر پھیل گئے ہیں اور توند بھی چھول گئی ہے۔"

اس پر دویا ساگر نے کہا "بھکشو! تتھاگت نے کہا تھا کہ جو بھکشو بہت کھا کے موٹا ہو گیا ہے اور
بہت سوتا ہے وہ جنم چکر میں پھنسا رہے گا۔ سونر کے سمان بار بار پیدا ہوگا اور مرے گا۔"

سنتو رسمارتھ نے کہا "گیانی، وہ بہت کھاتے ہیں اور دن رات پڑے سوتے ہیں اور گدھوں پر سوتے
ہیں اور ناری سے ہنس کے بولتے ہیں۔"

ناری سے ہنس کے بولتے ہیں؟" دویا ساگر نے دکھی آواز میں کہا۔

"ہاں پرمیشور ناریوں سے ہنس کے بولتے ہیں۔ اور میں نے تو یہ بھی دیکھا ہے کہ خود سنگھ کی بھکشو نیاں
کتنا بات کرتی ہیں اور جب نکھن پہنتی ہیں۔"

دویا ساگر نے آنکھیں موند لیں اور دکھ کی آواز میں بڑبڑایا: "ہے تتھاگت تیرے بھکشو نجھے

پھر گئے ہیں میں اس بھوسا گھر میں اکیلا ہوں۔"

سندر سمندر گوپال نے بھی آنکھیں موند لیں اور گڑگڑاتے ہوئے تھاگت ہم ایک ہیں اور تم بھی ہیں اور ہمارے اردگرد بھوسا گھر اُمنڈا ہوا ہے۔"

وہ آنکھیں موندے بیٹھے رہے۔ پھر سندر سمندر نے آنکھیں کھولیں اور کہا "گوپال تو نے یہ دیہان کیا کہ ہم آج پوری بستی میں پھرے ہیں۔ ہمیں بھکشا میں سب کچھ ملا، پر کھیر نہیں ملی۔"

گوپال نے ہاں میں ہاں ملائی "تو نے سچ کہا کھیر میں کسی گھر سے نہیں ملی۔ اور کھیر تو اب کبھی کبھی ہی دیکھنے میں آتی ہے۔"

سندر سمندر نے سوال اٹھایا "میں پوچھتا ہوں کھیر اب گھروں میں کیوں نہیں پکتی۔ کیا لوگ تھاگت کو بھول گئے ہیں یا گیوں نے دودھ دینا کم کر دیا ہے۔"

گوپال پچھلے دنوں کو یاد کر کے کہنے لگا "ان دنوں سب نرناری تھاگت کے نام کی مالا جپتے تھے اور گیوں کے تھن دودھ سے بھرے رہتے تھے اور گھروں میں کھیر اتنی پکتی تھی کہ گھر بار والے بھی بھر کے کھاتے تھے، پھر بھی بچ رہتی تھی۔"

"اور ہم کتنا سواد لے کر کھیر کھاتے تھے۔" سندر سمندر کے منہ میں پانی بھر آیا۔

وہ باپ کی طرف گھور کر اسے دیکھنے لگا "سواد ہم کو کھانا تو سواد کے لئے نہیں کرنا ہے۔"

"نہیں پرنتو" سندر سمندر نے جھینپ کر کہا "میں نے بھوجن کبھی سواد کے لئے نہیں کھایا۔ سدا یہی دھیان کر کے کھایا کہ مٹی میں مٹی مل جاتی ہے اور پیٹ بھرنا چاہئے۔ پرنتو جب کھیر آتی تھی تو یہ دھیان میں وہ کھیر آجاتی تھی جو سجاتا نے تھاگت کو کھلائی تھی اور میرے تالو اور جیبھ کو کچھ ہونے لگتا تھا۔"

وہ باپ سر نے گھور کر اسے دیکھا "سواد ہم کو کھانا تو سواد کے لئے بھوجن کرنا ہے۔"

"نہیں پرنتو" سندر سمندر نے جھینپ کر کہا "میں نے بھوجن کبھی سواد کے لئے نہیں کھایا۔ سدا یہی دھیان کر کے کھایا کہ مٹی میں مٹی مل جاتی ہے اور پیٹ بھرنا چاہئے۔ پرنتو جب کھیر آتی تھی تو یہ دھیان میں وہ کھیر آجاتی تھی جو سجاتا نے تھاگت کو کھلائی تھی اور میرے تالو اور جیبھ کو کچھ ہونے لگتا تھا۔"

وہ باپ سر نے دونوں کو سمجھاتے ہوئے کہا "بھوجن کرو، بھوجن کرو، بھوجن کرو۔ بھوجن کرو۔ بھوجن کرو۔ نہ ہو کر تم پھر اندر بیٹھ کے پچھلے جاپ میں پھنس جاؤ۔"

دونوں نے ہاں میں سر ہلا کر کہا "پرنتو ہم سواد کو تیاگ چکے ہیں۔ بس تھاگت کے دھیان میں رہتے ہیں۔"

[illegible]

[illegible] کبھی وہ گھڑی یاد ہے جب تتھاگت نے

[illegible]

[illegible] کی کوشش کی۔

[illegible] بول گیا [illegible] تتھاگت آ گئے [illegible] شانت

[illegible] ایک [illegible] کی [illegible] ہو گیا ہوا۔ بولے کہ اس کے ایک بھکشو [illegible] کے مقابلے

[illegible] چلنے کا [illegible] نے پوچھا۔

[illegible] تتھاگت [illegible] "[illegible] کی چادر [illegible] کلے [illegible] ہے [illegible] پھیل کے نکل جاتی ہے۔ انگ [illegible]

[illegible] ہے [illegible] کی [illegible] ہے پھر اوٹ کر لپٹتی ہے۔ لہنگا [illegible] لگتی ہے۔

پھر جڑھا لپٹتی ہے"۔

[illegible] دھیان سے سنتا رہا۔ اسے اس بیتی گھڑی کی یاد آئی جیسے سمندر اُمڈ کے آتا ہے تو۔

"گوپال تو نے کیسی بات یاد دلائی۔ اس مقابلہ بہت سخت تھا۔ بنارس کی تھی۔ نوٹنوں کا پھول بن پہلے اس

بستی میں [illegible] نوٹنی کی بھرتا اور کیسے [illegible] دھنوان سرکوٹ پہ جا کے بھکشا لیتا۔ پر اس کی سندرتا

نے مجھے ایسا [illegible] کیا کہ سب رستے بھول میں اسی چوکھٹ کا ہو رہا۔ روز بھکشا پاتر لئے اس دوار سے جاتا

اور [illegible] تھا کہ سندری بھکشو بھکشا لے۔ اس چھبیلی نے مجھ پہ بہت دیا اور بہت بھکشا دی۔ میں

نے بہت سوادلو، اور ایک دن تو [illegible] کہ میں نے جانا کہ گنگا [illegible] بدلوں گا۔ اندر سے جا کے

سنتا [illegible] دروازہ [illegible] کے سمان پڑی ہے گویا [illegible] پوچھ کر کبھی کوئی سرل کانت [illegible] کیا ہے۔

[illegible] کیسے بھرے بدن کو [illegible] پیٹ [illegible] لگا تھا کہ [illegible]

[illegible] پڑ [illegible] ہوئی [illegible] سانس [illegible] ہو [illegible]

"پھر کیا ہوا؟" گوپال نے پوچھا۔

سندر سمدر نے مری سی آواز میں کہا "پھر کیا ہونا تھا۔ میں نے باسنا کو رات اور بیٹھی بسی سے بے پیٹے نکل آیا"

سندر سمدر نے چپ ہو کر آنکھیں بند کر لیں جیسے دور کے دھیان میں کھو گیا ہو۔ پھر آنکھیں کھولیں دھیرے سے بولا "اب وہ کہاں ہوگی"

"کون؟" گوپال نے اچنبھے سے اُسے دیکھا۔

"وہی سندری"

"کون جانے کہاں ہو"

سندر سمدر اٹھ کھڑا ہوا۔ گوپال نے ایک اچنبھے کے ساتھ دیکھا کہ اس کے قدم بستی کی طرف اٹھ رہے ہیں۔ گوپال پکارا "بندھو پلٹ آ"۔ سندر سمدر کھویا کھویا چلتا چلا گیا۔ گوپال نے زور سے آواز دی "بندھو پلٹ آ"

ودیا ساگر خشک آواز میں بولا "سندر سمدر اب پلٹ کے نہیں آئے گا کہ وہ اب باسنا کے جنگل میں ہے"

گوپال چلایا "ہے ودیا ساگر ایسا جتن کر کہ وہ باسنا کے جنگل سے نکلے اور پلٹ آئے"

ودیا ساگر نے اسی خشک آواز میں کہا "ہے گوپال تو اسے بھول جا اپنے آپ کو بچا سکتا ہے تو بچا لے"

"پر بھو میری چنتا مت کر میں بچا ہوا ہوں"۔

ودیا ساگر نے اس پر کچھ نہیں کہا چپ رہا۔ پھر زہر بھری ہنسی ہنسا اور بولا "جو یاں سب سے بڑا بول بول رہا تھا وہ سب سے پہلے گیا۔ باسنا اسے ایسے بہا لے گئی جیسے باڑھ سوتے گاؤں کو بہا لے جاتی ہے"

گوپال ودیا ساگر کا منہ تکنے لگا پھر بولا "ہے گنی گیانی بولنے میں کیا برائی ہے"

ودیا ساگر کہنے لگا "بندھو شاید تو نے زیادہ بولنے والے کی جانک نہیں سنی اچھا تو

سُن ہمارے بدھ جی مہاراج ایک بار ایک دربار کے گھر جیسے تھے۔ بڑے ہو کے راجہ کے مشیر بنے مگر وہ راجہ بہت بولتا تھا۔ بدھ جی نے من میں وچار کیا کہ کسی پرکار راجہ پر جتایا جائے کہ راجہ کی بڑائی زیادہ بولنے میں نہیں۔ زیادہ سننے میں ہے۔

اب سنو کہ ہمالہ پہاڑ کی تلی میں ایک تلیا تھی۔ وہاں ایک کچھوا رہتا تھا۔ دو مرغابیاں بھی اُس وہاں آئیں۔ تینوں میں گاڑھی چھننے لگی۔ پھر ایک سمے ایسا آیا کہ تلیا کا پانی سوکھنے لگا۔ مرغابیوں نے کچھوے سے کہا کہ مت ہمالہ پہاڑ میں ہمارا گھر ہے وہاں بہت پانی ہے تو ہمارے سنگ چل وہاں چلیں سے گزرے گی۔

کچھوا بولا کہ "مت وہیں دھرتی پر رینگنے والا جانور۔ بھلا اتنی اونچائی پہ کیسے پہنچوں گا۔"

مرغابیوں نے کہا کہ "اگر تو یہ وچن دے کہ تو زبان نہیں کھولے گا تو ہم تجھے وہاں لے چلیں گے۔"

کچھوے نے چپ رہنے کا وچن دیا۔ مرغابیوں نے ایک ڈنڈی لا کے کچھوے کے سامنے رکھی اور کہا کہ پیچھے میں اپنے دانتوں سے پکڑ اور دیکھ یو لا مت۔ پھر ایک مرغابی نے اپنی چونچ سے ڈنڈی کا ایک سرا اور دوسری نے اپنی چونچ سے دوسرا سرا پکڑا اور اڑنے۔ اڑتے اڑتے جب وہ ایک نگر سے گزرتے تو بالکوں نے یہ تماشا دیکھا اور شور دیا۔ کچھوے کو بہت غصہ آیا۔ وہ کہنے لگا تھا کہ اگر میرے منہ میں ہمارا دیا ہے تو تم کیوں جل مرے۔ مگر اس نے یہ کہنے کے لیے جیسے کھولا ہی تھی کہ ٹپ سے زمین پر گر پڑا۔

اب سنو کہ یہ کچھوا جہاں گرا تھا وہ جگہ راجہ کے محل میں تھی۔ محل میں شور مچا کہ ایک کچھوا ہوا میں اڑتے اڑتے زمین پر گر پڑا ہے۔ راجہ بدھ جی کی سنگت میں اس جگہ آیا۔ کچھوے کی دُردشا دیکھ کے بدھ جی سے پوچھا ہے بدھ جی تو کچھ بتا کہ کچھوے کی یہ گت کیسے بنی۔

بدھ جی نے ترت کہا یہ بہت بولنے کا پھل ہے۔ اور کچھوے اور مرغابیوں کی پوری کہانی سنائی پھر کہا کہ جو راجہ بہت بولتے ہیں ان کی یہی دُرگت بنتی ہے۔

راجہ نے بدھ جی کی بات پر جی ہی جی میں وچار کیا بات اس کے جی کو لگی۔ اس دن سے

بھوسے پر ہوا۔ وہ کھڑا تھا اور زیادہ مضبوط تھا

یہ جاتک سنا کر وِدیا ساگر نے کہا کہ "بھکشوؤں! پورب کے زمانے میں بھی جو
مرتبہ بے موقع ہوئے گا وہ گر پڑے گا اور مارا جائے گا۔ تو نے دیکھا کہ سندر تھا کس بری طرح گرا اور مارا گیا"

گوپال کی یہ بات سن کر سب لوگ کھلکھلا کر ہنسنے لگے۔ گوپال کو گر پڑے دو دن گئے۔ پھر
کہا "اب میں چپ رہوں گا۔"

اور گوپال سچ مچ چپ ہو گیا۔ جاتا، دھیان کرتا، جھکتا، بیٹھتا، بستی جاتا اور کسی سے بات نہ کرتا۔ واپس
آجاتا۔ پر ایک دن اس بستی کے بیچ اس کے نگر باسی دو بچوں کے ستھ پر بات کرنے سے آن کہا۔ "بھائی
"چپ ستر میں تیرے لئے راج کا سندیش لایا ہوں۔ سن کہ تیرا پتا پرلوک سدھارا۔ اب راج گدی خالی
پڑی ہے۔ تیری ماتا تجھے بلاتی ہے اور تیری سندر استری سوہ سنگھار کئے تیری باٹ دیکھتی ہے"

گوپال نے کہا کہ "ہے متر! یہ ستھان دکھ کا استھان ہے۔ راج پاٹ موہ کا جال ہے۔ ماتا
پتا استری مایا کا کھیل ہیں۔ ہم بھکشو تتھاگت کے بھگت ہیں۔"

یہ کہہ کر گوپال مڑ لیا۔ پر بھاگ کر پیچھے سے لپکا۔ "متر میں نے تیری بات سنی۔ پھر بھی میں تجھ
سے کہتا ہوں کہ میں تین دن اس بستی میں رہوں گا اور اسی استھان پہ بیٹھ کے تیری باٹ دیکھوں گا۔"

گوپال واپس ہونے کو تو ہو لیا پر بہت بیاکل تھا۔ پرجا کی آواز رہ رہ کر اس کے کانوں میں گونج
رہی تھی۔ وہ وِدیا ساگر کے پاس آ کے، بیٹھا جیسے پیڑ سے پتا گرتا ہے۔ بولا کہ "ہے گیانی! میں
چپ ہوں پھر بھی گر رہا ہوں۔ ڈنڈی میرے دانتوں سے نکلی پڑ رہی ہے۔ میں کیا کروں؟"

وِدیا ساگر نے کہا "پھول کو دیکھو۔"

گوپال نے پاس کی ایک پھولوں کی جھاڑی کے سامنے آسن مار کر بیٹھا اور ایک پھول کو کہ ابھی
ابھی کھلا تھا، تکنے لگا۔ تکتا رہا۔ پھول مسکراتا رہا۔ پھر دھیرے دھیرے رنگ بے رنگ ہوا اور پھول
مرجھا گیا۔ گوپال کو جیسے کل آ گئی ہو۔ اپنے آپ سے کہا کہ "گوپال سنسار اسار ہے اور آنکھیں
بند کر لیں۔ پر جب پھر کھولیں اس نے آنکھیں کھولیں تو ڈالی پر ایک پھول کھلا ہوا تھا اور اس سے

[illegible] ہی آپ بستی کی طرف اُٹھنے لگے۔

[illegible] ہے۔ اس نے سوچا کہ آدمیوں نے اپنے آپ کو مکا مکا جانا اور پختہ ہو کر جنگل میں گھومنے لگا وہ کبھی اونچی اونچی گھاس کے بیچ چلا، کبھی کسی چٹیا پر پڑ لیا، کبھی کسی اونچی ڈگر پر سو لیا۔ اس کے ڈال ڈال پات پات کو دیکھا، پھولوں کو سونگھا، اور تتلیوں کو اڑتے دیکھا۔ ندی کنارے چلتے ہوئے شیتل دھارا کا شور سنا۔ اسے لگ رہا تھا کہ سارا سنسار آنند مگن ہے۔ اس نے جانا کہ اسے دستوگیان مل رہا ہے۔ اس نے سوچا کہ آدمیوں نے اپنی جگہ لگ آدمی کو دستوگیان بھی ملنا چاہیے۔

[illegible]

کتنے پیڑوں کی چھاؤں میں بسیرا کیا ہے۔ مگر کبھی املی کا پیڑ دکھائی نہ دیا۔ میں نے دھیان نہیں دیا تھا یا ان جنگلوں میں املی کا پیڑ ہوتا ہی نہیں اور یہ سوچتے سوچتے اس کا دھیان پیچھے کی طرف گیا۔ املی کا اونچا گھنا پیڑ، کمان کی سمان لمبی لمبی کٹاریں، اترتی اترتی طوطوں کی ڈاریں۔ جاڑوں کی رت میں بھرے بھرے طوطوں کی لمبی لمبی ڈاریں شور کرتی آتیں اور اس پیڑ پہ اترتیں۔ میں نے اس کے بعد بہت بن دیکھے، پر کبھی ایسا ہرا بھرا پیڑ نہیں دیکھا اور کبھی کسی پیڑ پہ اتنے طوطے اترتے نہیں دیکھے۔ اور پھر اس پیڑ کے ساتھ اُسے تھوڑا تھوڑا کر کے بہت کچھ یاد آیا۔ آس پاس پھیلے ہوئے اونچے نیچے مٹی میں اٹے رستے۔ ان پر دوڑتی گرد اڑاتی رتھیں۔ پیڑوں پہ دوڑتی گلہریاں گرگٹ اس کا قیچی لے کر گلہری کے پیچھے بھاگنا، گلہری کا اچک کر پیڑ پر چڑھنا، ٹہنی پہ جا کر دو ننھی ننھی ٹانگوں پہ کھڑے ہو کر اُسے دیکھنا اور پھر تیزی سے چھپ جانا کسی بھٹ میں سے دو سوہنی جیسی زبان کے ساتھ ایک لال لال منہ کا اچانک دکھائی دینا اور اوجھل ہو جانا اور اس کے سارے بدن میں ڈر کی ایک لہر کا سرسرانا۔ وہاں کوشمبھی اسی پیڑ تلے شام کے جھٹپٹے میں وہ اس سے ملی تھی جیسے ندی ساگر سے ملتی ہے۔ پہلے ہوتے ہوتے پھر وہ ڈالی کی طرح لچکتی لمبی باہیں اس کے گردن کے گرد گئیں اور ان کی آن میں وہ دونوں شام کے جھٹپٹے سے رات کے اندھیرے میں چلے گئے۔ یہ دھیان کرتے کرتے اس کے اندر ایک مٹھاس گھلتی چلی گئی مانو اس نے سوم رس پیا ہو۔ وہ سنگھیان نے اس نے من ہی من میں کہا اور ایک آنند میں ڈوب گیا۔

اس آنند میں وہ تنک دیر رہا۔ پھر بیاکل ہو گیا۔ اور اس نے سوچا کہ سب بھکشو پیڑوں کی چھاؤں سے نکل کر چبوتروں کے نیچے چلے گئے اور کھاٹوں پہ سونے لگے اور ناریوں سے آنکھ ملا کر باتیں کرنے لگے۔ اور وہ اکیلا بن میں بھٹکتا پھر رہا ہے سب پلٹ کر اپنے اپنے استھانوں پر چلے گئے۔ میں کیوں اپنے پیڑ سے دور ہوں۔ پیڑ کی یاد اس کے لیے بلاوا بن گئی اس کے پاؤں اس ڈگر پہ پڑ لئے جو اس جنگل سے نکل کر اس کے نگر کی طرف جاتی تھی۔

جنگل سے نکلتے نکلتے وہ ایک دم ٹھٹکا۔ ایک پرسبھو مورتی اس کے دھیان کا رستہ کاٹ

رہی کنفی اور روہا پہلیش جسے وہ بھول ہی گیا تھا کہ بے بھکشو اپنے وچاروں کی دیکھ بھال
رکھو اور اگر تم برائی کے رستے پر پڑ جاؤ تو اپنے آپ کو وہاں سے ایسے نکالو جیسے ہاتھی دلدل سے
نکلتا ہے۔ اس نے آگے اٹھتے ہوئے پاؤں کو روکا اور ایسے پلٹا جیسے ہاتھی دلدل سے نکلتا ہے۔

وہ ایک پچھتاوے کے ساتھ پلٹ کر آیا اور ایک پیپل کے پیڑ تلے پدماسن مار کر بیٹھ گیا۔ وہ
پچھتایا یہ سوچ کر کہ وہ کھلتے پھولوں اور بہتی ندی کو دیکھ کر خوش ہوا تھا۔ کیا تتھاگت نے نہیں کہا
تھا کہ بھکشو ہنسنا مسکانا کس کارن اور خوشی کس بات کی کہ سنسار تو دہکتا ہوا ہے۔ اس
نے اپنے اردگرد دیکھا۔ اس نے جانا کہ یہ سنسار اگن کنڈ ہے۔ ہر چیز جل رہی ہے۔ پھول، پتے
پیڑ، بہتی ندی، اور اس کی اپنی درشٹی۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں۔

وہ دونوں پدماسن مارے، آنکھیں موندے، گم سم بیٹھا رہا۔ پر اسے شانتی نہیں ملی۔ اس کا
دھیان بار بار بھکشاٹن اور اعلیٰ کے پیڑ کی طرف چلا جاتا۔ نراش ہو کر وہ اٹھا اور شانتی کے کھوج میں ایک
لمبی یاترا کی۔

ایک جنگل سے دوسرے جنگل میں، دوسرے جنگل سے تیسرے جنگل میں، چلتے چلتے اسکے پاؤں
خونم خون ہو گئے اور پاؤں سوجھ گئے اور ٹانگیں دکھنے لگیں۔ آخر کو وہ اروبلو کے جنگل میں جا نکلا۔ وہ
سہج سہج کر کے بودھی درم کے پاس گیا۔ اس اونچے گھنے برگد کو دیکھا جو ایک دیوتا سمان پیڑوں کے
بیچ کھڑا تھا۔ وہ اس پیڑ کے نیچے پدماسن مار کے بیٹھ گیا۔ ہاتھ جوڑ کر بنتی کی کہ ہے شاکیہ منی ہے تتھاگت
ہے امی تابھ، یہ بھکشو نیرا کچھوا ہے اور رستے میں ہے۔ وہ آنکھیں موند لیں اور بڑبڑایا "شانتی
شانتی، شانتی"۔

بیٹھا رہا بیٹھا رہا۔ دن بیتتے چلے گئے اور وہ پتھر بنا بیٹھا رہا۔ پھر ایسا ہوا کہ دھیرے دھیرے
شوک اس کے جی سے دھل گیا۔ من میں آنند کی ایک کونپل پھوٹی اور دھیان میں ایک ہرا بھرا پیڑ
ابھرا۔ وہ پیڑ وہی اعلیٰ کا پیڑ تھا۔ وہ اٹھ بیٹھا۔ جانا کہ اس نے کیسا پاپ کیا۔ یہی کہ ہر تیسری کا اپنا
جنگل اور اپنا پیڑ ہوتا ہے۔ دوسرے جنگل میں ڈھونڈنے والے کو کچھ نہیں ملے گا۔ چاہے

[illegible] جو [illegible] گا اپنے جنگل میں [illegible] اپنے پیر کی چھاؤں میں [illegible] گا۔

[illegible] سے نکلے [illegible] اس کے پیر [illegible] ہے [illegible]

[illegible] ایک دراز [illegible] کی اس کے [illegible] ہے [illegible] سے چھوٹ گئی

ہے۔ اس دراز میں اس کا ایک پاؤں رہ گیا جنگل میں تھا اور دوسرا پاؤں اپنے پیر کی طرف

اٹھا ہوا تھا اور آگ کی [illegible] اور آگ دہک رہی تھی۔

نتّی

اگلے دن وہ پھر اسی گلی میں گیا اور اسی دور سے کھڑا رہا۔ پھر وہی کومل پیروں والی ڈیوڑھی پر آئی اور پھر اس نے نتّی نظروں کے ساتھ بھکشا پاتر آگے کر دیا اور بھکشا لے کر چلا گیا۔ یہی اس کا نیم تھا۔ کتنی ڈیوڑھیوں سے کتنی ناریوں کے ہاتھوں سے اس نے بھکشا لی تھی مگر کبھی نظر اٹھا کر کسی کو نہیں دیکھا۔ اس نے جان لیا تھا کہ نتّی ناری پیپل کے پتے سے زیادہ پاپی ہے۔ جو دکھائی دیتا ہے وہ سب مایا کا جال ہے۔ دیکھنے والی مایا کے جال میں پھنستا ہے اور دکھ اٹھاتا ہے۔ سو کومل دکھ دینے والی ہے۔ سو مت دیکھو۔ مت پھنسو اور مت دکھ اٹھاؤ۔ سو وہ نہیں جانتا تھا کہ بھکشا کس ہاتھ سے مل رہی ہے۔ اس نے یہاں بھی نہیں دیکھا کہ بھکشا دینے والی کون ہے کیسی اس کی صورت ہے۔ بس جیسے کومل پیر اس کی آنکھوں کے سامنے پل بھر کے لیے آتے اور وہیں ٹھہر جاتے۔ وہ اس ڈیوڑھی پر ایک دن بارہ دن تک اور آتا رہا یہاں تک کہ بھکشا اس ڈیوڑھی سے بہت شروع کے ساتھ ملنے لگی۔

وہ بسنت پنچمی کا دن تھا۔ گلی کی دور سے دیکھتی ساڑھیوں پر سرخ پھول بانو سرسوں کھیتوں میں نہیں کاہیوں میں پھولی ہوئی اور گیندا کیاریوں میں پھول ڈالیوں میں مہکتے اس سے

آج پھر اسی دوار سے جا کے سانکل بجائی اور پھر کومل پیروں والی ڈیوڑھی پہ آئی پر آج ان پیروں میں مہندی لگی تھی۔ اس نے جھکی نظروں سے ان پیروں کو دیکھا اور اچنبھا کیا کہ گورے پیروں میں مہندی کیسی رچتی ہے اور پیر کیا سے کیا بن جاتے ہیں۔ وہ اچنبھے سے مہندی رچے گورے کومل پیروں کو تکنے لگا۔ یہ دھیان ہی نہ رہا کہ اسے بھکشا بھی لینی ہے۔

"بھکشو جی! جلدی کرو تیج ہار کا دن ہے۔" اور اس آواز کے ساتھ کہ یہ آواز آج اس نے پہلی بار سنی تھی بھکشا پاتر کے ساتھ ساتھ اس کی نظریں بھی اٹھ گئیں۔ اور پھر اٹھی ہی رہ گئیں۔ کیا موہنی مورت تھی۔ مکھ چندرما جیسا، بال گھٹا سے آنکھیں مرگ کی سی، گردن مورنی کی سی۔ چھاتیاں ناشپاتیاں، گات بھری بھری، کمر پتلی پتلی، ساڑھی لپیٹی، ماتھے پہ لال بندی۔ وہ سدھ بدھ کھوئے ٹکٹکی باندھ کے تکنے لگا وہ سندری ایسی ہڑبڑائی کہ بھوجن سے بھری تھال ہاتھ سے گر پڑی۔

سنجے اس شبھ دن خالی پاتر کے ساتھ اپنے استھان پر واپس آیا۔ من کو ایک چنتا لگ گئی تھی۔ کیا مجھے موہ نے آگھیرا ہے۔ بہت وچار کیا، کچھ سمجھ میں نہ آیا جیسے اس کی مت ماری گئی ہو۔ آنند کے پاس پہنچا اور بولا کہ "پربھو! میں بیاکل ہوں۔"

آنند نے اسے دیکھا جیسے ٹوہ رہا ہو "کارن؟"

"ناری۔"

"ناری؟"

"ہاں ناری۔" اور سنجے نے اپنی ساری بپتا کہہ سنائی۔

آنند اچنبھے کے ساتھ آنکھیں کھولے اس کی بپتا سنتا رہا۔ پھر اس نے آنکھیں موند لیں۔ آنکھیں موندے چپ بیٹھا رہا۔ پھر آنکھیں کھولیں اور بولا "بھدر! انگلیاں اور ڈیوڑھیاں موہ کا جال ہیں۔ بھکشوؤں کا نیم یہ ہے کہ وہ گلیوں میں رکتے نہیں اور ڈیوڑھیوں میں ٹھہرا نہیں کرتے۔ گلی گلی، دوار سے دوار پھرتے ہیں۔ بھکشا آج یاں سے کل واں سے۔ پر مورکھ تو نے اس نیم کا پالن نہیں کیا تو نے وہی کیا جو سندر سمدر نے کیا تھا۔"

"سندر سمندر نے کیا کیا تھا؟"

"تو نہیں جانتا سندر سمندر نے کیا کیا تھا؟"

"نہیں پربھو، میں نہیں جانتا کہ سندر سمندر نے کیا کیا تھا۔"

تب آنند نے سنجے کو سندر سمندر کی کہانی سنائی۔

سندر سمندر کی کہانی

"جنم اشٹمی کا دن تھا۔ سہانی رت منگل کے ابھاؤں کی رم جھم ہو رہی تھی۔ ایک جھونپڑی میں ایک بڈھا بڑھیا دھار دھار رو رہے تھے۔ ایک کنچنی ادھر سے گزری تو اس نے اچرج کیا۔ "دکھیارو! تم پر کیا بپتا پڑی ہے کہ آج جنم اشٹمی کے دن جب ہر نر ناری بوڑھا بالک اتسب مناتا ہے تم آنسوؤں کی گنگا جمنا بہا رہے ہو۔"

وہ دکھ سے بولی "اری ہمارے لیے نہ اب جنم اشٹمی ہے نہ ہولی دیوالی ہے۔ پوت کے بچھڑنے کا روگ ایسا ہے کہ ہر گھڑی اسے یاد کرتے ہیں اور روتے ہیں۔"

"پوت بچھڑ گیا؟"

"اری ہمارے ایک ہی تو پوت تھا وہ ہم سے بچھڑ گیا اور ہماری دنیا اندھیر کر گیا۔"

"کیسے بچھڑ گیا؟"

"ایک دن بدھ دیو کا اس نگر سے گزر ہوا۔ ان کے اپدیش نے اسے ایسا بولا کہ کہاں تو بھیکشو بنا پھرتا تھا اور کہاں یہ کہ سر منڈایا، پیلا باناپہنا اور شاکیہ منی کے پیچھے ہو لیا۔"

"اس پوت کا نام کیا ہے؟"

"سندر سمندر۔"

"اچھا میں تمہارے پوت کو واپس لاؤں گی۔"

"اری تو کیسی بات کرتی ہے۔ شاکیہ منی کے سنگھ میں جا کے کون واپس آیا ہے۔"

کنچنی نے تاؤ کھایا۔ بولی "وہ اپنے سمے کا منی ہے تو میں بھی اپنے سمے کی کنچنی ہوں۔"

یہ کہہ وہ وہاں سے چلی۔ شاکیہ منی کا اتا پتا پایا کہ ان دنوں کہاں براجتے ہیں اور کس نگر میں ان کے بھکشو بھکشا لینے پہنچتے ہیں۔ اسی نگر پہنچ ایک اونچی حویلی سے وہاں رہ پڑی۔ سندر سمدر ہر روز بھکشا پاتر لے بستی میں پہنچتا، کبھی اس گلی میں کبھی اس گلی میں۔ ایک روز اس گلی میں آیا اور اس اونچی حویلی کی ڈیوڑھی پہ پہنچا۔ وہ کنچنی تو باٹ ہی دیکھ رہی تھی۔ جھٹ لے کے خود ڈیوڑھی پہ آئی۔ ایسی چترائی سے بات کی اور بھکشا دی کہ سندر سمدر نے اگلے دن پھر اسی گلی کا پھیرا لگایا اور اسی ڈیوڑھی پہ آئی۔ پھر وہ اس ڈیوڑھی سے ایسا ملا کہ دوارے دوارے جانا چھوڑ دیا۔ روز اس ڈیوڑھی پہ جا کھڑا ہوتا اور بھکشا پاتر بھروا کے لوٹتا۔ ایک دن چترائی سے کہنے لگی کہ "بھکشو جی، تمہارے نیم میں کوئی فرق نہ پڑے تو آج یہیں پہ ٹھہرو اور بھوجن کرو۔ میں جانوں گی کہ میری کٹیا کو چار چاند لگ گئے۔"

سندر سمدر نے وچار کیا۔ پھر دل میں کہا کہ تتھ گت نے کبھی کسی کو نا نہیں کیا۔ ایک مورکھ نے ان کے سامنے بھوجن کے تھال لا کے رکھ دیا۔ اس پہ بھی نا نہیں کہا اور ماس کھایا۔ مجھے بھی یہی نیتی اپنانی چاہیے۔ سو سندر سمدر نے اس دن اسی ڈیوڑھی میں بیٹھ کے بھوجن کیا۔ اس کنچنی نے دوسرے دن بھی یہی اچھا کی اور سندر سمدر نے پھر اس کی اچھا مان لی۔ بس سندر سمدر روز ہی اس ڈیوڑھی میں بیٹھ کے بھوجن کرنے لگا۔

سندر سمدر کو نتی ڈیوڑھی پہ بار بیٹھنے کے بعد اس کنچنی نے گلی کے بالکوں کو بہلایا پھسلایا اور سکھلایا کہ جب بھکشو جی ڈیوڑھی میں بیٹھ کے بھوجن کریں تو تم گلی میں خوب دنگا کرنا اور دھول مٹی اڑانا۔ میں دکھاوے کے لئے ڈانٹوں ڈپٹوں گی۔ تم بالکل مت ٹلنا۔ اگلے دن ان بالکوں نے یہی کیا۔ کنچنی نے بالکوں کو ڈانٹا ڈپٹا۔ مگر انھوں نے ایک کان سنی اور دوسرے کان اڑا دی۔ اگلے دن کنچنی سندر سمدر کے سامنے ہاتھ باندھ کے کھڑی ہو گئی، کہا کہ "پربھو جی، گلی کے بالک باتیں کرتے ہیں کہ دھنی لڑکے بھوجن کو خراب کرتے ہیں۔ میں بنتی کرتی ہوں کہ آپ نہ رات پدھاریں اور بھوجن کریں۔"

سندر سمدر نے پھر بنتی کو یاد کیا اور کنچنی کی بات چپ چاپ مان لی۔ اس دن

سے سندر سمندر ڈوبتی ہی سے نکل اندر دالان میں بیٹھ کے بھوجن کرنے لگا وہ بھوجن کرتا اور کنچنی اس کی سیوا کرتی سیوا کرتے کرتے چھب دکھلاتی۔ کیا اس کنچنی کی چھب تھی اور کیا روپ تھا۔ صورت سرخ سفید جیسے سیب انار چنپا ناگن جیسی۔ بھنویں کمان سی۔ گول گدرائی چھاتیاں کمر پتلی کولہے بھرے بھرے۔ سندر سمندر جب اس کی اور دیکھتا تو جی اس کا ڈولنے لگتا۔

تتھاگت نے اپنے بیان سے جانا کہ ان کا ایک بھکشو کس گت میں ہے۔ ان دنوں تتھاگت نے اپنے پورے سنگھ کے سنگ سراوستی کے باہر انا تھ پنڈک کے باغ میں باس کیا تھا۔ سب سنگھی اپدیش سننے کے لئے اکٹھے ہوئے۔ تتھاگت ایک گھنے آم تلے پدماسن مار کر بیٹھے اور آنکھیں موند لیں پھر دیر بعد آنکھیں کھولیں۔ سنگھیوں کو تکا۔ پھر ان کی گیان بھری نظریں سندر سمندر پہ آ کے ٹھہر گئیں۔ ٹکٹکی باندھ کے دیکھتے رہے۔ پھر بولے "سنگھی! تیرا من کس کارن اچاٹ ہے؟"

سندر سمندر نے سر جھکا لیا اور رکتے رکتے بولا "ہے تتھاگت، موہ کے کارن۔"

تتھاگت ٹکٹکی باندھے اسے دیکھا کئے۔ پھر بولے "بھکشو! موہ میں رکھ ہے کامنا آدمی کی ذلت کرتی ہے۔ کامی آدمیوں سے وہ بندر بھلے جنھوں نے یہ بھید جان کر گرہ میں باندھا اور سکھ پایا۔"

بھکشوؤں نے پوچھا "ہے تتھاگت! وہ بھلے بندر کون تھے اور کہاں تھے؟"

"کیا تم نے بھلے بندروں کی کہانی نہیں سنی؟

بھلے بندروں کی جاتک

برسوں پہلے موئے منش جاتی سے دور پربت ہمالہ کی تلہٹی میں بندروں کی برادری رہتی تھی۔ ایک بار ایسا ہوا کہ کوئی شکاری ادھر آ نکلا۔ اس نے ایک بندر کو جتن کر کے پکڑا اور بنارس جا کے راجہ کو دے دیا۔ اس بندر نے راجہ کی ایسی چاکری کی کہ اس نے پرسن ہو کے اسے آزاد کر دیا۔

وہ بندر لوٹ کے اپنے جنگل پہنچا تو برادری اس کے گرد اکٹھی ہو گئی سب پوچھنے لگے۔

"بندھو تو اتنے دنوں کہاں رہا؟"

"بندھو! میں منش جاتی کے بیچ رہا۔"

"منش جاتی کے بیچ؟ . . . . . اچھا؟ . . . . . پھر بتاؤ کہ تو نے اس جاتی کو کیسا پایا؟"

"بندھو! یہ مت پوچھو۔"

"ہم تو پوچھیں گے۔"

"اچھا یہ بات ہے تو سنو کہ منش جاتی میں بھی نر مادہ ہوتے ہیں جیسے ہمارے بیچ ہوتے ہیں پرانتو نر کی ٹھوڑی پہ لمبے لمبے بال ہوتے ہیں اور مادہ کی چھاتیاں بڑی بڑی ہوتی ہیں، اتنی بڑی کہ تھل تھل کرتی ہیں۔ تھل تھل چھاتیوں والی ٹھوڑی پہ بال والوں کو موہ میں پھنساتی ہے اور دکھ دیتی ہے۔"

بندروں نے کانوں میں انگلیاں دے لیں۔ چاہئے "بندھو بس کر ہم نے بہت سن لیا" پھر وہ اس ٹیلے سے یہ کہہ کے اٹھ گئے کہ ہم نے یہاں بیٹھ کے بڑی کی بات سنی ہے۔ اب یہاں سے اٹھ جانا چاہیئے۔

تتھاگت یہ جاتک سنا کے چپ ہو گئے۔ پھر بولے "بھکشو! سننے والا بندر میں تھا سننے والے بندر وہ تھے جو آج میرے بھکشو ہیں۔"

ایک بھکشو نے جسنے پوچھا کہ "تتھاگت ناری مرد کو کیسے دکھ دیتی ہے جب کہ مرد بلوان ہے اور وہ نربل ہے؟"

تتھاگت مسکرائے "بھولے بھکشو! ناری نربل ہے تو کیا ہوا۔ چاند جو ہوئی اپنی چترائی سے بلوان کے بل نکال دیتی ہے کیا تم نے چاند راجکمار کی جاتک نہیں سنی؟"

"نہیں تتھاگت!"

"تو سنو!"

اتر راجکماری کی جاتک

بہت پرانے زمانے کی بات ہے کہ بنارس میں ایک راجہ تھا جس نے تکشیلا جا کے ودیا حاصل کی۔ بہت ہوشیار بہت بلا کا حسین۔ اس کے ایک پتہ ری تھی۔ یہ سوچ کر کہ بیوی خراب نہ ہو جائے وہ اس پر بہت کڑی نظر رکھتا تھا۔ پرنا ری کو سات تالوں میں بھی رکھو تو وہ خراب ہو کے رہتی ہے۔ راجہ نے بہت چوکسی کی مگر راجکماری کے لیے ایک ربیہ سے لڑ گئے۔

نہیں لڑنے پر ہے کی صورت نہیں نکلتی تھی کہ ایک میں چوکی پہرہ بہت تھا۔ سیانے اپنی دایہ کو اپنا بھید دے دیا اور محل میں بھیجا۔ وہ محل میں جا کر راجکماری کی چوکر بن گئی۔ ساتھ ہی ساتھ ربیہ کو بھی لے لیا۔ راجکماری نے ربیہ کی بات کی چاہ کی۔ ایک دن کی بات ہے کہ وہ بیٹھی راجکماری کے ساتھ چوپڑ کھیل رہی تھی۔ خوش ہو کر ہنسے اس نے منہ سے کہا کہ راجکماری بھی ہنسی۔ ربیہ کا جواب بیکار ڈال دیا کہ۔ جب پوری ہنسی منہ سے پھوٹ گئی اس نے کہا۔

"میں نے تو صرف کہا۔ یہ چیتنا سے کیسے ہوں؟"

"ہاں ہاں کوئی بڑی بات ہے صرف ہنسا ہی تو ہے۔ ہنسی کیسی اور صرف ہنسی۔"

یہ سن کر راجکماری کا اور ربیہ کو جواب دینے میں کیسی کیسی کہا تھا۔ سب اشارے سمجھ کر ایک بات ہی ایک نوجوان سے لڑکے کو دیا جب سارے دن کے دن سے وہ کاہل نہیں گھر میں بیٹھ کر ہاتھی پر بیٹھ کر لڑکے کو ساتھ لیا جس کی دیوار سے جا پہنچی۔ اور وہاں بیٹھ کر ہنسے کہا کہ ہمارا ہنسی ہنسی ہو رہی ہے میں تو اس دیوار میں اشنان کروں گی۔

راجہ نے بہت بلایا پر وہ نہ آئی۔ اشنان کے لیے سیدھی نکلی اور اس منڈیر پر جا بیٹھی جس کے برابر ہاتھی پر سوار بیٹھا تھا۔ راجہ نے یہاں بھی چوکسی کی۔ اس کے پیچھے پیچھے سپاہی بھی جب وہ کہ سے نہ ہٹی تو اس نے منہ پھیر لیا۔ پر راجکماری کی کہانی کو پکڑ کے رہ گئی۔ راجکماری بھی ہنسی ہنسی۔ اس نے اپنا کھولنے کے بہانے کلائی راجہ کے ہاتھ سے چھڑا لی۔ پھر گلاب کی پھول بھر کے لڑکے کی طرف جو کے ہاتھ میں پکڑ دی اور خود منڈیر سے کود کر ہاتھی پر بیٹھ گئی۔ پھر جا دوجا۔

اندھیرے میں رجیہ کو کچھ پتہ نہ چلا کہ کیا ہو گیا۔ اور پھر یوں بھی اس نے منہ پھیر رکھا تھا۔ جس طرح منہ پھیرے کلائی پکڑے واپس ہوا۔ راجکماری کی اٹاری میں اسے دھکیل آگے سے سانکل لگا دی۔ جب صبح ہوئی تب پتہ چلا کہ راجکماری تو رسیا کے ساتھ بھاگ گئی۔ رجیہ نے یاد کیا کہ ناری کی چوکسی کٹھن کام ہے۔ کلائی پکڑ لو تو بھی جل دے جاتی ہے۔"

"تھا گت جاتک سنانے کے بعد چپ ہوئے پھر بولے "بھکشو! جانتے ہو وہ راجہ کون تھا وہ راجہ میں تھا کہ پچھلے جنم میں راج گدی پر بیٹھا تھا اور ایک میری پیاری تھی۔" چپ ہوئے، پھر گہرا سانس بھر کے بولے "میں نے پراکرتی کے بھید جاننے پر ناری کے بھید بھاؤ نہیں جان پایا۔"

سندر سمدر جیسے سوتے سے جاگ اٹھا۔ ناری کے چکر کو جانا اور اس چکر سے نکلنے کی ٹھانی۔ من میں کہا کہ آج میں اس ناری سے کہہ دوں گا کہ کل سے میری باٹ نہ دیکھیے۔ یہ پرتگیا کر کے وہ اس ڈیوڑھی پر پہنچا۔ کنچنی نے روز کی طرح اس کی آؤ بھگت کی اور اندر سجا کے دالان میں بٹھایا۔ پھر آج اس کے سکھلائے ہوئے بالکوں نے ڈیوڑھی کے اندر آ کے دھما چوکڑی شروع کر دی۔ اس رنڈی نے پہلے تو بالکوں کو ڈانٹا پھٹکارا۔ پھر جب وہ نہ مانے تو سندر سمدر سے کہا کہ "بھکشو جی! یہ بالک رول مچاتے ہیں اور تمہیں ستاتے ہیں۔ اچھا ہو کہ اوپر کوٹھے پہ چل کے بھوجن کرو۔"

سندر سمدر یہ سن کر پہلے تو رکا۔ پھر سوچا کہ لوگ بالک سمان ہیں ان کی اچھا پوری کرنی چاہیئے یہی بدھ نیتی ہے اور یوں بھی آج اس گھر میں میرا آخری بھوجن ہے۔ کل میں کہاں اور یہ گھر کہاں بس یہ سوچ کے وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ آگے آگے کنچنی پیچھے پیچھے وہ۔ وہ سیڑھیاں چڑھتا چلا گیا۔ اپنے پیروں پر نظریں جمائے ایک ایک سیڑھی چڑھ رہا تھا۔ اس نے کہاں یہ دھیان دیا کہ آگے کون چل رہا ہے۔ مگر آگے جانے والی کئی بار رک کے کھڑی ہو گئی جیسے وہ ٹھٹک گئی ہو اور پھر سندر سمدر بے دھیانی میں ایک نرم نرم سائے کے ساتھ چھو گیا۔

سیڑھیاں چڑھ کے کنچنی نے سندر سمدر کو ایک سجی بنی اٹریا میں لے جا کے نرم سیج پہ بٹھا دیا۔ پھر آپ بھی برابر میں بیٹھ کے پسر گئی۔ سیڑھیاں چڑھ کے میں تو تھک گئی اور اسے مرے بند ہو

ناری کے پاس مرد کو پھنسانے کے چالیس گر ہیں۔ وہ کنجوس ان چالیسوں گروں میں پوری ہوتی تھی
اس نے پہلے تو ایک لمبی انگڑائی لی۔ انگڑائی لیتے ہوئے بازو کہنیوں تک ننگے تھے اوپر اٹھائے، پھر شرما
کے منہ کے گرا دیں، پھر ناخن سے ناخن کھرچنے لگی۔ پھر دانتوں میں ساڑھی کا پلو دبا کے لجائی
بلا کسی کارن کے زور سے ہنسی، پھر ایک دم سے ہاتھوں میں منہ چھپا لیا۔ آپ زور زور سے
بولی۔ پھر ایسے ہولے ہولے بولی جیسے کان میں سرگوشی کر رہی ہو۔ پہلے دور ہٹ کے بیٹھی، پھر وہ
بیسوا بھڑک کے بیٹھ گئی۔ چپ نیوں سے چوڑ ہٹکایا پھر اوپر سرکا لیا۔ رانوں سے ساڑھی سرکائی
پھر جلدی سے نیچے کر لی۔ اور ایک بار تو ایسی انگڑائی لی کہ پنڈا کھل گیا۔ پھر وہ جلدی سے سمٹ گئی
ایک بار موٹے ہونٹوں کے پاس سے آئی۔ پھر شرما کے پیچھے ہٹ گئی۔ اور اسے مرے
[illegible] تو بالکل موہبت ہو گیا بھول کہ وہ کنجوس ہے اور وہ تو پہلے ہی سے گرمائی
ہوئی تھی۔ اسے گرما دیا [illegible] کس کیسی بے جب نے [illegible] پہ کوئی [illegible]
[illegible]
[illegible] ہو گیا۔ [illegible] کے لیے [illegible]
[illegible]
[illegible]
کام ندی میں ڈوبتے ڈوبتے باہر نکل آیا۔
[illegible]
[illegible] کوئی [illegible]
[illegible] کوئی [illegible]
[illegible] سے کون بچا رہے گا؟

آنند بولا "ہے سنجے میں تجھ سے وہی کہتا ہوں جو امی تابھ نے مجھ سے کہا تھا کہ آنند تو اب آپ اپنا دیپ بن۔"

سنجے نے یہ سن کر وچار کیا پھر کہا کہ میں آپ اپنا دیپ بنوں گا۔ سو دوسرے دن جب وہ بھکشا پاتر لے کے بستی کی اور چلا تو پرتگیا کی کہ وہ اس گلی میں نہیں جائے گا۔ پر جب وہ بستی میں داخل ہوا تو اس نے کیا دیکھا کہ یہ رستہ اسی گلی کی اور جا رہا ہے جس رستے پر چلتا تھا کہ وہ رستہ اسے اسی گلی میں اسی ڈیوڑھی پر لئے جا رہا ہے۔ وہ ٹھٹھک کر کھڑا ہو گیا۔ پھیلی ہوئی نرادکی آج کتنی سمٹ گئی تھی اس نگر کی ایک گلی اس کی کھونڈی ہوئی تھی۔ ہر گلی کی ہر ڈیوڑھی سے وہ بھکشا لے چکا تھا۔ مگر آج جس گلی جس ڈیوڑھی کا اس نے دھیان کیا لگا کہ وہاں وہ ہاتھ میں تھال لیے اس کی باٹ دیکھتی ہے۔ وہ ایک بار پورے نگر کو دھیان میں لایا۔ پھر اس نے اچنبھا کیا کہ کتنی گلیاں ہیں کہ جاں کے سمان پھیلی ہوئی ہیں۔ ہر گلی کی کتنی ڈیوڑھیاں ہیں کہ ہر ڈیوڑھی میں کوئی ناری بھکشا دینے کے لیے کھڑی ہے گلیاں، ڈیوڑھیاں، ناریاں۔ اس نے سوچا کہ یہ سب مایا کا جال ہے کچھ وہ ان کھیلے بندھنوں کو دھیان میں لایا جنھوں نے ناری کی بات سن کے کانوں میں انگلیاں دے لی تھیں اور اس استھان کو چھوڑ دیا تھا جہاں انھوں نے یہ بات سنی تھی۔ مجھے بھی یہ نگر چھوڑ دینا چاہیے اور وہ نگر سے منہ موڑ کے جنگل کی اور ہو لیا۔

گلیاں، ڈیوڑھیاں، ناریاں سب پیچھے رہ گئی تھیں۔ سنجے اب گھنے جنگلوں میں چل رہا تھا چلتے چلتے اس نے چھوٹے ہوئے ایک اشوک کے پیڑ کو دیکھا اور رک گیا۔ اس پیڑ کے نیچے اس نے نرجن باس کیا۔ بسنت رت تھی۔ سرسوں پھولی ہوئی تھی۔ گیندا مہک رہا تھا۔ اشوک کی ڈالیاں اپنے ہی بوجھ سے جھکی ہوئی تھیں۔ سنجے یہ سماں دیکھ کے بہت پرسن ہوا۔ اشوک کو دیر تک دیکھتا رہا۔ پھر وہ اچنبھے سے من ہی من میں کہنے لگا کہ ہے رام کس کنیا نے اس اشوک کو ٹھوکر ماری ہے کہ وہ اتنا پھولا ہے۔ بس اس وچار کے ساتھ اس کا دھیان مہندی والے اجل کومل پیروں کی اور چلا گیا۔ کب اس اشوک کو ان مہندی والے اجل کومل پیروں نے ٹھوکر ماری ہے وہ مہندی یستنی ساتھی میں

لپٹی اس کے دھیان میں ابھری۔ تھوڑی دیر تک وہ اس دھیان میں ایسے ڈوبا رہا کہ کسی بات کی سدھ بدھ ہی نہ رہی۔ مگر پھر اچانک وہ چونکا۔ یہ تو میں پھر موہ کے پھندے میں پھنس رہا ہوں۔ وہ ترت وہاں سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اس پیڑ تلے برائی کی بات میرے دھیان میں آئی ہے مجھے یہاں سے اٹھ جانا چاہیئے۔

سنتے نے پھر ایک لمبی یاترا کی۔ وہ جنگل جنگل مارا پھرا۔ دن گزرے۔ مہینے بیتے۔ رتیں چڑھیں اور اتریں۔ ہر رت اپنی چھب دکھا کے ساتھ آتی اور بیت گئی۔ رت سنتے کو دکھی کر کے کبھی پھولتی سرسوں، کبھی بور لدے آم، کبھی دودھیا جھنجھنا بھونرا، کبھی منڈلاتی بھنبھیری، کبھی دکھیا کوئل کی پکار، کبھی اداس دادر کی جھنکار، کبھی چمپا کی مہکار، کبھی بیلے کی باس، تو یوں کہو کہ ہر رت آتی اور یادوں کی سوغات دے کر جاتی۔ سرسوں نے پیلے کپڑے پہن کر جاتی سردی کے بیتا پن لوٹ کے آجاتا اور وہ سندر مورت سامنے آکھڑی ہوتی۔ سنتے سوچ میں پڑ جاتا کہ یہاں بھی سب رستے سمی دوار کی اور جاتے ہیں۔ جب وہ بار بار بعد اس نے یہ تت نکالا کہ تیس چھ اندری سے ملی ہوئی ہیں اور ہر تت اندر دکھ کے پانچ دروازے ہیں۔ آدمی موہ میں کس کس راہ سے پھنستا ہے۔ کبھی کوئی کوئل چھو کے، کبھی کوئی رسیلی بانی سن کے، پھر کبھی کوئی مہک اسے اڑا لے جاتی ہے۔ جی تک رستے لے ڈوبتا ہے۔ سو بات یوں ہے کہ ہر رت دکھ دیتی ہے۔ یہ جان کر وہ اداس ہوا اور دکھی ہوتے کہا کہ نگر میں گلیاں ہیں اور جنگل میں تیس ہیں۔ موہ کے جال سے کب نکلوں۔

سنتے انہیں وچاروں میں تھا کہ پت جھڑ آ گئی۔ دن اداس ہوئے۔ ڈال ڈال سوکھے پتے جھڑنے لگے ہوا کے ہر جھونکے کے ساتھ ان گنت پتے ٹہنیوں سے گر کر وہاں ڈھیر ہو جاتے۔ سنتے پت جھڑ سے کیا کچھ آئی ہے۔ سنتے پر سوچ میں ڈوب گیا۔ دیکھتے دیکھتے پیڑ کے اندر کن من سوئی اسے کچھ کچھ یاد آنے لگا تھا۔ پھر اسے ایک یاد دوسری یاد کی ڈور لے گئی اور یہ سمی جنگل تھا۔ تھا گت سنتے پت جھڑ میں کیا تھا۔ دگر دیکھے پیلے سوکھے پتے کیسے ترسے تھے۔ ہاتھ بڑھا کر پتوں سے تھی جو کی چھاؤں کو دیکھا۔ "آہ! کیا سب

پتے میری مٹھی میں آ گئے ہیں؟"

آنند جھجکا پھر بولا "ہے تتھاگت، یہ رُت پت جھڑ کی ہے۔ پتے جنگل میں اتنے جھڑے ہیں کہ ان کی گنتی نہیں ہو سکتی۔"

تتھاگت نے کہا "آنند! تو نے سچ کہا۔ پت جھڑ کے ان گنت پتوں میں سے میں بس ایک مٹھی اٹھا سکا ہوں۔ یہی گت سچائیوں کی ہے جتنی سچائیاں میری مٹھی میں آئیں میں نے ان کا پرچار کیا۔ پر سچائیاں ان گنت ہیں۔ پت جھڑ کے پتوں کے سمان۔"

اس بات نے اس پر نرالا جادو کیا کہ وہ جہاں کا تہاں کھڑا رہ گیا۔ پھر نہ ایک قدم آگے بڑھا نہ ایک قدم پیچھے ہٹا۔ وہیں ایک گھنے پیپل کی چھاؤں میں آسن مار کے بیٹھ گیا اور گرتے زرد سوکھے پتوں کو تکنے لگا۔ پت جھڑ کے ان گنت پتے ان گنت سچائیاں۔ ایک حیرانی کے ساتھ وہ گرتے پتوں کو دیکھ رہا تھا۔ دیکھتا رہا۔ دیکھتے دیکھتے اس کی آنکھیں مندتی چلی گئیں۔ [illegible]

[illegible] آسن مارے آنکھیں موندے بیٹھا رہا۔ بیٹھا رہا جانے کتنے دن [illegible]

[illegible] آنکھیں کھولیں تو [illegible] ان گنت پتے بیت گئے ہیں اور اب وہ پت جھڑ میں [illegible] کی [illegible] زرد سوکھے پتے بکھرے تھے۔ وہ زرد سوکھے پتوں میں نہایا ہوا تھا اور دھوپ [illegible] رہا تھا۔ اس نے نظر اٹھا کے دیکھا۔ جس پیپل کو کھلتے دیکھ کے وہ اس کی چھاؤں میں بیٹھا [illegible] اس پیپل کا ایک ایک پتہ جھڑ چکا تھا۔ پھر اس نے [illegible] ڈالی [illegible] تک دھرتی کو زرد [illegible] سے ڈھکا پایا۔ دور تک پیڑ لنڈ منڈ کھڑے اداس لگتے تھے۔ اس نے اپنے شانت من میں [illegible] تھا کہ میری کامنا [illegible] زرد سوکھے پتوں کے ساتھ جھڑ چکی ہیں پھر اس نے [illegible] کہ بسنت رت [illegible] رت [illegible] سے [illegible] جاتی ہے [illegible] جاتی ہے [illegible] سے [illegible] جاتی ہے [illegible] پت جھڑ [illegible] ہے وہ مسکرایا جیسے اس کی مٹھی بھر گئی ہو۔ وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ اب وہ شانت تھا۔ من میں کہا کہ میری یاترا [illegible] ہو گئی۔ اب مجھے واپس جانا چاہیے۔

[illegible] میں خالی پاتر جیسا کل من کے ساتھ گیا تھا۔ جنگل سے بھری مٹھی اور شانت من سے

[illegible] جنگل سے نکل آیا تھا۔ اب وہ بھری بستی میں تھا۔ شراوستی میں اس سمے کیسی چہل پہل
تھی۔ لگتا تھا کہ نگر نہیں پھول باغ ہے۔ رنگ اور سوگندھ کی ندی امنڈی ہوئی تھی۔ چہکتے ہنستے
مہکتی کیاریاں۔ سندر نارییاں رنگ رنگ کی ان کی ساڑیاں۔ گلیوں میں آتیاں جاتیاں۔ اس نے ایک
بیراگ کے ساتھ یہ سب کچھ دیکھا۔ ایک بار جی میں آئی کہ بستی کے بیچ کھڑا ہو کے چیتاونی دے
کہ سب اگیا ہو۔ ہے شراوستی کے باسیو! رنگ رس میں مت ڈوبو۔ پھول کمہلا جاتے ہیں۔ پھل
پک جاتے ہیں۔ رنگ روپ اتر جاتا ہے۔ جوبن ڈھل جاتا ہے۔ سندرتا کی سب ریتیں آتی جاتی
ہیں۔ بیت جاتا امرت ہے۔ پرمن میں تو بیراگ رچ گیا تھا۔ بولنے کو اب جی کب چاہتا تھا۔ مگر آنکھیں
جو اس نے شراوستی کی گلیوں سے گزرا۔ آنکھوں نے یہ بھی نہ دیکھا کہ کون گلی میں ہوا اور کس دوارے جا
[illegible] دیکھیں۔ مطلب تو بھکشا سے ہے۔ بیراگی کو [illegible] کب کا [illegible]
[illegible] سے [illegible] نظروں سے [illegible] والی کے پیروں کو [illegible] اور [illegible]
[illegible] سے [illegible] جو [illegible] کہیں کہ [illegible]
[illegible] بھکشا [illegible] کے [illegible]
[illegible] سکے [illegible]
[illegible] بیت [illegible] رہا [illegible]
[illegible] تھی [illegible]
[illegible] ایک [illegible]
[illegible] پہنچ [illegible]
[illegible] پیچھے [illegible]

واپس

"سوامی شمبھو! تب بدھو بوچی نے آنکھیں کھولیں اور کہا کہ "بھگشوؤ! یہ پہلی بار نہیں ہوا۔ پہلے بھی ہو چکا ہے۔" بھگشو بدھ کے سوچ میں پڑ گئے۔ پوچھا کہ "بھنتے! کب ایسا پہلے کب ہوا تھا؟"

تب بدھو بوچی نے ایک جاتک سنائی جو اس پرکار ہے کہ بنارس کے سندر نگر کے، جہاں ایک مرگھٹ تھا، جہاں بہت سے کتے رہتے تھے۔ ان میں ایک کتا ان سب کا گرو تھا۔ سب کتے اس گرو کا بہت آدر کرتے تھے۔

ایک دن کی بات ہے کہ بنارس کا راجہ اپنے رتھ میں بیٹھ کر سیر کو نکلا۔ دن بھر سیر کرنے کے بعد شام کو راجہ کے رتھ کا سامان باہر پڑا چھوڑ دیا۔ رات کے سمے وہاں ہوئی تو سارا سامان بھیگ گیا۔ اس سامان میں رتھ کے گدے بھی تھے جن پر چمڑا منڈھا ہوا تھا۔ یہ چمڑا بھیگ گیا۔ رات کو کتوں نے چمڑے کو گیلا پا کر دانتوں سے کاٹا اور کھا گئے۔

دوسرے دن راجہ تک بات پہنچی کہ کتے رتھ کے گدوں کا چمڑا کھا گئے۔ راجہ نے تاؤ میں آ کر منادی کرا دی کہ کتے جہاں دکھائی دیں انہیں مار ڈالو۔ بس پھر کیا تھا، بنارس نگری

کے کتے مارے جانے لگے۔ یہ سب وہی کتے تھے جو شمشان گھاٹ میں ٹھکانا کرتے تھے جب مرنے لگے تو اپنے گرو کے پاس جا کے اپنی بپتا سنائی اور دہائی دی کہ "گرو دیو! ایسا ہے کہ رانی محل کے پالتو کتے نگر میں دندناتے پھرتے ہیں اور شمشان گھاٹ کے باسی بیتا کا دن مارے جاتے ہیں۔

گرو نے یہ بات سن رانی محل کی راہ لی۔ راجہ کے چاکروں نے اسے بہت دھتکارا مگر اس نے اب نہ سنی اور سیدھا راجہ کے سامنے پہنچا اور کہا کہ "اب منش جاتی کے راجہ! کتوں نے تیرا کیا بگاڑا ہے کہ تو ان کی جانوں کا بیری ہو گیا ہے۔"

"انہوں نے میرے رشتے کے گدھے کاٹ کھائے۔" راجہ اچنبھے سے بولا۔

"تو نے ان کی چوٹ کی کہ نگر میں جو کتا دکھائی دے اسے مار ڈالو۔"

"اے راجہ! یہ تو رانی محل کے کتوں پر بھی لاگو ہوتا ہے۔"

"نہیں۔ وہ میرے شرن میں ہیں۔"

"کیسا نیاؤ ہے کہ پرجا راجہ کے شرن میں ہیں۔ نردوش مارے جائیں۔"

"اسے کتے کیسے جانے کہ یہ رانی محل کے کتوں کا کیا دوش ہے۔"

"راجہ نے جلادوں کو آدیش کیا۔ اپنے کتوں کو دودھ بھات کھلایا اور گلی گلی پھرا اور تماشا دیکھو۔"

راجہ کے حکم سے ... گلی گلی میں سوائے اپنے کتوں کو دیکھ کر جو کتا دکھائی دیتا، جلادوں کے ہاتھ سے اس کی جان لیتا۔ نگر سے کتے اگل دیئے۔ راجہ کے شمشان گھاٹ کے کتوں کو معافی دی۔ راجہ کے کتے کو گرو میں باندھ دیا۔ ... مگر ... کتے ... مکتی پا گئے۔ لاکھوں برس بعد راجہ کے چیلے پھر سے ہی ہو گئے۔ جیسے پہلے تھے۔

بدھ دیو جی کا کتھا سن کے جب ہم نے پوچھا کہ ... جنم کا ... ہیں۔

"تم؟" سب بھکشوؤں نے حیرت سے پوچھا۔

"ہاں میں، وہ راجہ اندر تھا۔ کتوں کا گرو میں تھا۔ شمشان گھاٹ کے دوسرے کتے تم تھے۔"

"ہم؟"

"ہاں تم۔ تم نے اپنے کرموں کے کارن آگے چل کے آدمی کا جنم لیا اور پھر تم میرے شِشیہ بنے۔"

"اور راج محل کے کتے؟"

"وہ۔ وہ ابھی تک کتے ہیں۔"

اگر سبھی نے یہ جاتک سن کے سب بھکشو چکر میں پڑ گئے اور وچار کرنے لگے۔ دریا کے گوتم نے لمبی ٹھنڈی سانس لی اور کہا کہ "وہ کیا منگل سمے تھا کہ ہم شمشان گھاٹ کے کتے تھے اور تتھاگت ہمارے سنگ تھے۔ ہمارے ہی کارن تو انھوں نے یہ جنم لیا تھا۔ انھوں نے کسی جوگی جیسا کتنی کرتے کتنی آدمی بن گئے تھے۔ اور اب کہ ہم آدمی کے جنم میں ہیں۔ آدمی آدمی نہیں رہتے۔ ہر سے آدمی دکھائی پڑتے ہیں۔ پرانا رشتہ ....."

اگر سبھی نے بات کاٹی اور کہا کہ "یہ پہلی بار نہیں ہوا۔ آگے بھی ایسا ہو چکا ہے۔"

"اگر ہم نے کب جانا کہ آگے بھی ایسا ہو چکا ہے؟"

"ہم نے بھی تتھاگت سے ایسا ہی سنا ہے۔" اور گوتم نے ایک جاتک سنایا کہ اس طرح ہے:

بہت پہلے کی بات ہے جب بنارس کے راج شمشان پر راجہ جنمدہ پرانا تھا اور راج محل میں ہمارے بودھ ویو کی اکثر بھکشو تھے راج کے رتھ پر جاتے تھے۔ وہ بھی بودھ ستوا جنم میں تھے۔ اس کارن انھیں سب محل کے نوکر چاکر دیوتا کہتے تھے۔ پہلے انھوں نے دیوتا کہہ کر پکارا اور سارے کی دیوتا پرتھا ڈالی۔ پھر اکھی سالوں برس لگاتار کہتے رہے۔ پھر ان پیوں سے بھکشو کو سمجھا۔ راج شمشان پر جب دیوتا کو دیکھتے تھے بہت سے درباریوں کی نیت میں کھوٹ آگیا۔ انھوں نے کہا کہ راج کمار جی بالی عمر کے ہیں راج کے

کار کیسے کر پائیں گے۔ دو دو برس میں جیسے لوگ جیتے تھے وہ کتنے تھے کہ راج کے سامنے ساتوں دیپ
بڑی میں پرجا کے چھینے ہیں۔ راج کرنے کے لیے ورن بنا چاہیے۔ کھوٹی نیت والوں نے کہا کہ
اچھا یہ بات ہے تو ابھی پرشن کیے جاتے ہیں۔ دو دو کا وہ دو دو کا پانی ہوا جاتا ہے وہ کیسے چندر
کو شال دوشت اور ہیں کر دو۔ دو دو آدمیوں پر چیکر اور ہیں کے سامنے لے گئے اور کہا کہ جب راج
کا یہ بہت دو دو ہی آدمی ہیں۔ راج کار لیے ہیں تمہارے کی بہت سہاتا کر پائیں گے۔ تم نے ہمیں
نیے منتری منڈل ہیں لیے ہیں۔ یہ جیسنتو جی نے اسے سر سے پیر تک دیکھا اور کہا کہ منتری ہونا اس
نہیں منوبے۔ کچھ آدمیوں کی سہاتا چاہیے۔ جہاں چندر منتری بن جائیں وہاں اس کے سوا
کب ہو کہ پرجا دکھی ہو گی راج چوپٹ ہو جائے گا۔

کھوٹی نیت والے اپنا سا منہ لے کے چلے گئے۔ پر دوسرے تیسرے دن وہ پھر اسے
آدمیوں کے بھیس میں پگڑی دھوتی بندھوا کر لائے اور کہا کہ اسے راج کمار یہ تمہارے
بنا کے راج میں نیا یک تھے۔ جو دو دن کھوٹ اس کی نیائے کا چرچا تھا۔ تم بھی اسے نیا یک
بناؤ اور پرجا کی اور سے نچنت ہو جاؤ۔

بدھیسنتو جی نے ٹھنکی باندھ کے اسے دیکھا۔ تاڑ گئے کہ یہ آدمی نہیں بولے کہ متر و کیسی
بندر بھی نیا یک ہوتے ہیں۔

پس اس کے ساتھ کھوٹوں کا پول کھل گیا اور بدھیسنتو جی سنگھاسن پر بیٹھ کے راج کرنے
لگے۔ انہوں نے سدھرمہ کے ساتھ راج کیا اور پرجا کو سکھ دی۔ ۲۱۰ سنگھاسن کا
ہاتھ برس تک اثر رہا۔ لاکھوں برس تک لوگوں نے آدمی اور بندر کے انتر کو یاد رکھا اور امن
چین سے رہے۔

اگر سین جاتک سنا کے چپ ہو گیا۔ دوسرے بھکشو بھی کہ دھیان سے جاتک
سن رہے تھے چپ بیٹھے رہے۔ پھر گوتم نے سر اٹھایا اور بولا کہ "اے گر سین کیا وہ برس
پورے ہو چکے ہیں؟"

اگر سین نے جواب دیا کہ "اگیانی، تو دیکھتا نہیں کہ دنیا کی کیا دشا ہو گئی ہے اور لوگ کیسے مورکھ ہو گئے ہیں۔ پھر بھی تو پوچھتا ہے کہ کیا لاکھ برس پورے ہو گئے ہیں۔

گوبند بولا "پرکھو! ہم پلٹ نہ چلیں؟"

"کہاں؟"

"بنارس کے شمشان گھاٹ میں۔"

اگر سین نے سے گھور کے دیکھا، کہا "مورکھ! ہم نے لاکھ برس تک جنم جنم کے کشٹ کھینچے ہیں تب کہیں لوٹ پیٹ کے آدمی بنے ہیں تو پھر ہمیں پیچھے جنم میں سے جانا چاہتا ہے۔"

"ہم آدمی تو بن گئے ہیں۔۔۔۔" وہ کچھ کہنے لگا تھا مگر پھر رک گیا اور بس رکا کہ دیر تک ایک بات بھی نہ کی۔ پرکھ کے اندر ایک کھلبلی مچی ہوئی تھی۔ رہ رہ کے وہ سوچتا کہ لاکھ برس بیت گئے ان لاکھ برسوں میں میں نے کتنے جنم لیے اور کتنے کشٹ کھینچے۔ اتنے میں آدمی کا جنم لیا۔ پر اس جنم میں۔۔۔۔۔ یہ سوچتے سوچتے وہ دکھی ہو گیا۔

بالکل اندھا اور گونگا بنا کے وہ دیر تک آنکھیں موندے گم سم بیٹھا رہا۔ اس کے جنم کے جیون نے اسے بہت دکھی دیا تھا۔ دھیرے دھیرے اس کا جیون پچھلے جنموں کی اور بڑھا۔ دھیرے دھیرے سے لگا لاکھ برس سامنے آکھڑے ہوئے ہیں۔ اپنے ان گنت جنموں کے سنگ۔ دھیان ہی دھیان میں وہ اپنے پاؤں چلنے لگا۔ وہ جنم سے پچھلے جنم میں، پچھلے جنم سے اور پچھلے جنم میں، پھر اور پچھلے جنم میں۔ دھیان ہی دھیان میں اس پرسار سے پچھلے جنم بیت گئے۔ اور اس نے دیکھا کہ وہ بنارس کے مرگھٹ کی چوکھٹ پہ کھڑا ہے۔ وہ چونک پڑا۔

گوبند نے آنکھیں کھولیں۔ ادھر ادھر دیکھا۔ سب جگت دھیان میں گم بیٹھے تھے۔ اگر سین پرسن سے آنکھیں موندے دھیان ساگر میں ڈوبا تھا۔ اس آن اسے دنیا بہت اجاڑ دکھائی دی۔ بنارس کا مہا شمشان اپنے جیوں سمیت اسکی آنکھوں میں پھر رہا تھا۔ میں مرگھٹ کا باسی مرگھٹ سے دور اس سنسار میں اجنبی ہوں۔ اس کے اندر ایک لہر اٹھی اور وہ اپنا کیسری باناں اوڑھ کر

پائر سنبھال اٹھ کھڑا ہوا۔

کرین نے آنکھیں کاموں کے سے دیکھا۔ "یہ تھوا کدھر جانے کے دھیان میں ہے؟"

"بنارس کے مرگھٹ کی اور۔"

"بنارس کے مرگھٹ کی اور؟"

"ہاں بنارس کے مرگھٹ کی اور۔" اور وہ پیچھے پر دیکھے بنا عمر کی جلد کی چادر اور سنگینیوں کی آنکھوں سے اوجھل ہو گیا۔

○

رات

"یار اس پہ مجھے ایک لطیفہ یاد آگیا۔"

"کیا"؟

"لطیفہ یا حکایت جو کچھ بھی سمجھو۔ ایک عامل کو اس کا ہمزاد سونے نہیں دیتا تھا۔ جب سے نیند آجاتی تو ہمزاد آن دھمکتا۔ کہ مجھے کام بتاؤ۔ عامل اسے دور دور کے کام بتاتا کبھی پورب کی طرف بھیجتا کبھی پچھم کی راہ دکھاتا۔ کبھی سات سمندر پار کی مہم پر روانہ کرتا۔ ہمزاد چشم زدن میں وہ کام انجام دیتا۔ اور پھر آن اس وقت جب اس کی آنکھ لگتی آن موجود ہوتا۔ کہ کوئی اور کام بتاؤ۔ عامل اس سے بہت دق تھا۔ آخر ایک دن اس نے جھنجھلا کر پاس کھڑے گھنگھریالے بالوں والے پالتو کتے کی طرف اشارہ کیا اور کہا کہ اس کے بال سیدھے کر۔ ہمزاد اس کام میں لگ گیا مگر اس کام نے اسے الجھا دیا۔ ہمزاد بار بار اس کے بال سیدھے کرتا۔ اور بار بار وہ پھر مڑ جاتے۔ پس پھر ہمزاد رات بھر کتے کے بال سیدھے کرتا رہتا۔ اور عامل اطمینان سے سویا رہتا۔"

بابا جی یہ حکایت سن کر بہت محظوظ ہوئے۔ دونوں مل کر خوب ہنسے۔ پھر بابا جی کو کچھ خیال آیا۔

کہنے لگا: "ہم تو آج بیٹھے ہوئے ایسے ہنس بول رہے ہیں جیسے ہمیں اس کے سوا کوئی کام نہیں ہے لگتا ہے۔ آج کی رات ہم ہنس بول کر ہی گزار دیں گے۔

"یاجوج" ماجوج بولا۔ "ہمیں کبھی کبھی بول بھی چاہیے۔ کہ ہمیں کم از کم یہ یاد تو رہے کہ زبان کس کام کے لیے بنی ہے۔"

یاجوج کو ماجوج کی یہ بات اچھی نہیں لگی۔ کہنے لگا "ماجوج بولنا کون سی کمال کی بات ہے۔ سب ہی لوگ جنہیں خدا نے زبان دی ہے بولتے ہیں مگر ہم بولنے سے بڑا کام انجام دے رہے ہیں۔"

"بڑا کام تو ہم انجام دے نہیں پائے۔" ماجوج بولا۔ "صرف اس چکر میں ہم چھوٹے کام سے بھی گئے۔"

"میرے یار تھوڑا صبر کرو۔ جو زبانیں اس دیوار کو چاٹنے کی صلاحیت رکھتی ہیں۔ وہ بول بھی سکتی ہیں۔"

پتہ نہیں وہ دن کب آئے گا۔ جب ہم بوڑھے ہو گئے ہوں گے۔ فی الحال تو یہی لگتا ہے تاکہ ہم جیسے ہی اس لیے ہوئے ہیں کہ اس دیوار کو چاٹتے رہیں۔ تا آنکہ آئے اور ہمیں چاٹ لے۔" ماجوج کا چہرہ بولتے بولتے کبھی کبھی ایسے لگتا ہے کہ ہمیں موت بھی نہیں آئے گی جیسے ہم اس دیوار کو ازل سے چاٹ رہے ہیں اور ابد تک چاٹتے رہیں گے۔" یہ کہتے کہتے اس نے تامل کیا۔ پھر اچانک بولا۔ "ہم نے کسی ساحل کے کنارے بیٹھے ہیں۔ اس نے ہمیں کتنے سوال پیدا کرنے پر نہیں لگایا۔ دیوار چاٹنے پر لگا دیا۔"

"یہ تو بیکار کہہ رہا ہے۔" یاجوج ماجوج کا منہ تکنے لگا۔

"میں ٹھیک کہہ رہا ہوں۔" یاجوج ماجوج یہ دیوار نہیں چکر ہے۔"

یاجوج سن کر بہت چکرایا۔ اس کا دل بیٹھ گیا مگر جب اس نے ایک نظر دیوار پر ڈالی تو اسے چٹانوں کی تہہ پر کر اس میں کچھ سے حوصلہ پیدا ہو گیا۔ "دیکھو بابا۔ اگر یہ چکر ہی ہے تو آج رات رات میں اسے ختم کر دیں گے۔ تو دیکھتے نہیں کہ ابھی اول رات ہے۔ اور ہم نے دیوار کتنی چاٹ لی ہے۔"

یاجوج اٹھ کھڑا ہوا اور دیوار چاٹنے کے لیے متعلق ہوا۔ مگر ماجوج جس بیٹھا رہا جمائی لیتے ہوئے بولا۔

"یہ روز روز کے چکر سے میں بالکل بور ہو چکا ہوں تو دیوار کو چاٹ لیں گے

"تو کہاں جائے گا؟"

"بس کسی الاؤ پہ جا کے بیٹھوں گا ہاتھ تاپوں گا اور کہانی سنوں گا۔"

"یار واقعی کتنے دن ہو گئے کہ ہم نے کسی الاؤ پہ جا کے بیٹھ کے کوئی کہانی سنی۔" ایک دم سے کتنے بھولے بسرے الاؤ، جو ماضی کے تصور میں زندہ ہو گئے۔ بیچ میں دہکتی ہوئی آگ، اردگرد بیٹھے ہوئے لوگ، ہر عمر کے کوئی جوان کوئی بوڑھا۔ اور درمیان میں بیٹھا ہوا کوئی بزرگ کہ رات کے چار دن کے ساتھ کہانی کا جادو جگا رہا ہے۔ "یار تو یہاں مجھے اکیلا چھوڑ جائے گا۔"

"پھر تو بھی چل۔"

یا جوج ڈانواں ڈول ہو گیا۔ سے ڈانواں ڈول دیکھ کر ماجوج نے ٹہوکا "یار چھوڑ اس پوتیا چکر کو۔ چار دن سے الاؤ پہ چلتے ہیں اور آخر سے کہانی سنتے ہیں کتنے زمانے سے ہم نے اس بزرگ سے کہانی نہیں سنی۔"

یا جوج پر ماجوج کی بات اثر کر گئی۔ وہ اٹھتے ہی لگا تھا کہ نظر دیوار پر جا پڑی۔ دیوار کو دیکھتے ہی اس کی نیت بدل گئی۔ "یار یہ پروگرام کل تک کے لئے ملتوی نہیں ہو سکتا۔"

"کل کیا ہو جائے گا جو آج صورت ہے وہی کل ہو گی۔"

"نہیں مجھے یقین ہے۔ آج رات ہم اس دیوار کو ضرور چاٹ ڈالیں گے۔ کل ہم بالکل فارغ ہوں گے۔"

"چھوڑ یار کب سے ہم آج کل آج کل کر رہے ہیں۔ اسی آج کل ہی میں ہم نے عمر کی کتنی سہانی راتیں ضائع کر دیں۔"

"یار جہاں اتنی راتیں ضائع کی ہیں وہاں ایک رات اور سہی آج کی رات اور اس دیوار کو چاٹ کر دیکھتے ہیں۔"

"اچھا اس شرط پہ رکتا ہوں کہ بس آج کی رات اور ہم اس دیوار کو چاٹیں گے پھر کل کی رات میں یہاں نہیں لگانی۔"

"مان لی تیری شرط"

یہ طے ہو جانے کے بعد دونوں سرگرمی سے اپنی لمبی لمبی زبانیں نکال کر دیوار چاٹنے لگے۔ رات گئے تک دیوار کو چاٹنے کے بعد دونوں ایک ذرا دیر کے لیے رُکے۔ یاجوج نے دیوار کا جائزہ لیا تو دیکھا کہ وہ تو بالکل ورق بن گئی ہے اس نے اطمینان کا سانس لیا۔ سوچا کہ بس اب تو رکھوں کی سوئیاں رہ گئی ہیں۔ مگر ماجوج کو نیند آنے لگی۔ اس نے کہا کہ "یار یاجوج بس ذرا ایک چسکی لے لوں۔ بہت نیند آ رہی ہے" یہ کہہ کے وہ بس فوراً ہی سو گیا۔ اور خراٹے لینے لگا۔ اس کے خراٹوں نے عجیب اثر کیا کہ یاجوج بھی اونگھنے لگا۔ اس نے سوچا کہ اب کون سا ایسا کام رہ گیا ہے کیوں نہ میں بھی چسکی لے لوں۔ اور وہ بھی سو گیا۔

یاجوج ماجوج دونوں جیسے گھوڑے بیچ کر سوئے آنکھ ان کی اس وقت کھلی جب سورج سر پر آ گیا اور انہوں نے کیا دیکھا کہ دیوار پھر اپنی ضخامت اور بلندی کے ساتھ ان کے سامنے کھڑی ہے۔ یہ دیکھ کے ان غریبوں کا جی ڈوبنے لگا۔

یاجوج ماجوج دن بھر جیسے ڈھٹے پڑے رہے جیسے کوئی دیوار ڈھٹی پڑی ہو۔ جب شام ہوئی تب کہیں ان میں جان آئی انہوں نے ٹھنڈے پیٹھ ہوش و حواس درست کیے۔ یاجوج نے دیوار کی طرف دیکھا اور سامنے کے بڑھتے اندھیرے میں وہ دیوار اسے اپنے سر پر پہاڑ کی طرح کھڑی نظر آئی۔ مگر یہ طے ہو چکا تھا کہ اب اس دیوار کو چاٹنا نہیں ہے

ماجوج پیدنی سے کھڑا ہوا۔ "چلو یہاں سے چلیں"

"کہاں؟"

"بارودت کے ملک چلتے ہیں۔ یہ ایک نو دریافت ملک ہو گا۔ وہاں کے باشندوں سے ملیں گے اور آخر سے کہانی سنیں گے۔"

دونوں یاجوج ماجوج بارودت کے ملک کی طرف چلنے لگے۔ وہاں پہنچے تو کسی کو دیکھا۔ ایک بڑا الاؤ جلا رہا ہے کوئی اور جلی لکڑی کی چھوٹی سی رکھ کے گرد بیٹھا ہے۔ یہ ماجوج کے ہم

نہیں ہوا ہے۔ دونوں بہت حیران ہوئے کہ آخر یاروں پر کیا گزری۔ کہ الاؤ اب یہاں گرم نہیں ہوتا۔

دیر بعد ایک آدمی اُدھر سے گزرتا ہوا نظر آیا۔ اسے روک کر پوچھا کہ بھائی آج کی شب الاؤ گرم نہیں ہوا۔

"الاؤ؟ کیسا الاؤ؟ یہاں تو کوئی الاؤ گرم نہیں ہوتا۔

"جاروت کہاں ہے؟"

اس آدمی نے دونوں کو غور سے دیکھا "تم کس کی بات کر رہے ہو۔ جاروت نے مدت ہوئی یہ الاؤ چھوڑ دیا۔ وہ اب حویلی میں رہتا ہے اس وقت وہ آتش دان کے سامنے بیٹھا ہوگا۔"

"حویلی۔ وہ کیا ہوتی ہے؟"

اس آدمی نے دونوں کو پھر غور سے اور حیرت سے دیکھا "تم تو بالکل جنگلی لگتے ہو۔ حویلی کو نہیں جانتے کہ کیا ہوتی ہے۔ اونچی دیواریں۔ موٹی چھتیں۔ بھاری دروازے۔ بس یہی حویلی ہوتی ہے۔"

"دیواریں۔ اچھا تو جاروت نے دیواریں کھڑی کر لی ہیں۔" یاجوج ماجوج حیران رہ گئے۔ پھر پوچھا "اور آنثر کہاں ہے؟"

"آنثر؟ اجی وہ بوڑھا قصہ گو، وہ تو زمانہ ہوا مر گیا۔"

"آنثر مر گیا" یاجوج ماجوج نے تعجب سے پوچھا اور افسوس کرنے لگے۔

"اچھا آنثر کا بیٹا عمر کہ ہمارا یار تھا کہاں چلا گیا۔ سنا ہے تو وہ یہیں تھا۔ اس وقت تو دیکھتے کیا تھا۔"

"فلم" یاجوج ماجوج ایک مرتبہ پھر متحیر ہوئے۔

آدمی ہنسا "اب تم پوچھو گے کہ فلم کیا ہوتی ہے۔"

"نہیں! اب اس کے آگے ہم کچھ نہیں پوچھیں گے۔" اور یاجوج ماجوج وہاں سے آگے پاؤں پھرے اور جہاں سے چلے تھے وہیں پھر آ بیٹھے۔

"یار دنیا بہت بدل گئی ہے۔" یاجوج سوچتے ہوئے بولا۔

"یار کہاں سے کہاں پہنچ گئے۔" ماجوج تلخ سی ہنسی ہنسا۔

"ہم یہاں دیوار چاٹتے رہ گئے وہاں یاروں نے نئی دیواریں کھڑی کر لیں۔ اور چھتیں بھی ڈال لیں۔" یہ کہتے کہتے اس کی آواز میں ایک دکھ پیدا ہو گیا۔ "ہم تو دیوار کو نہ چاٹ سکے دیوار ہی نے ہمیں چاٹ لیا۔"

"ہم نے اپنے کتنے روز و شب اس دیوار پر صرف کئے اور دیوار ہے کہ جوں کی توں کھڑی ہے۔" اس وقت یاجوج بھی دکھی ہو رہا تھا۔

"روز و شب" ماجوج نے یاجوج کی بات کاٹی۔ "مجھے تو یوں لگتا ہے کہ ہماری ساری زندگی ایک لمبی رات ہے جس میں ہم محض ہمارے رات کے کئے کرائے کو اکارت کرنے کے لئے نمودار ہوتی ہے۔"

"ہوں۔" یاجوج یہ مزہ دار جملہ سن کر بڑبڑایا اور چپ ہو گیا۔

"رات بہت ہو گئی ہے اب ہمیں سونا چاہئے۔" ماجوج نے جمائی لیتے ہوئے کہا۔

یاجوج ماجوج بہت راتوں کے جاگے ہوئے تھے۔ سو چا تھا کہ لمبی تان کر سوئیں گے آنکھیں دھوؤں کی تپش سے بوجھل تھیں۔ مگر عجیب ہو کہ لیٹتے ہی نیند غائب ہو گئی رات کٹنے کا وہ کروٹیں بدلتے رہے۔

"یار نیند نہیں آ رہی۔" یاجوج نے ایک لمبی جمائی لی اور اٹھ کے بیٹھ گئے۔

"مجھے بھی نہیں آ رہی۔" ماجوج بھی اٹھ کے بیٹھ گیا۔

یاجوج ماجوج اٹھ کے بیٹھ گئے تھے۔ نیند نہیں آ رہی تھی۔ اب کیا کریں رات ایسے کیسے کٹے گی۔ ماجوج بولا۔ "آؤ باتیں ہی کریں۔"

"باتیں۔" یاجوج افسردہ ہو گیا۔ "دیوار کو چاٹتے چاٹتے میری زبان اتنی زخمی ہو گئی ہے کہ میں زیادہ بول نہیں سکتا۔"

ماجوج بولا۔ "میں تو روز صبح کو سینکڑوں کے پانی سے غرارے کرنے کے بعد شروع

کا دیا ہوا منہ سے لگا لیتا ہوں میری زبان کو تو اس سے بہت آرام آجاتا ہے۔"

"وہ تو بار بار میں بھی کرتا ہوں۔ مگر یہ تو روز کا قصہ ہے زخم بھرنے نہیں پاتے کہ نئے زخم پیدا ہو جاتے ہیں۔ ایسی حالت میں پھٹکری کے غرارے اور شافی جراح کا مرہم ہمیں کتنا فائدہ پہنچا سکتے ہیں۔"

"یہ بھی ٹھیک ہے۔"

"ویسے یار میرا خیال ہے" یاجوج سوچ کر بولا۔

"میری زبان بھی کچھ سوئی پڑ گئی ہے۔"

"جب نہیں بولو گے تو زبان سوئی ہی پڑے گی۔ ہمارا باپ کہا کرتا تھا بولتے رہو گونگے نہ ہو جاؤ۔"

"یہ تو ٹھیک بات، مگر یار ایک وقت میں ایک ہی کام ہو سکتا ہے۔"

"ہاں۔" ماجوج نے ایک ہلکی سی تلخی کے ساتھ کہا۔

"ہاں ایک وقت میں ایک ہی لایعنی کام کیا جا سکتا ہے۔" ماجوج نے یاجوج کے بیان میں تھوڑی سی اصلاح کر دی۔ پھر بولا۔ "یار کبھی کبھی جب میں بولتا ہوں تو مجھے یوں لگتا ہے کہ جیسے میں نہیں بول رہا۔ دیوار چاٹ رہا ہوں۔" یاجوج ماجوج کی بات سن کر سوچ میں پڑ گیا۔ اسے شک تھا کہ بولتے وقت اس کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوتا ہے۔

"یار اب سونا چاہیے۔" وہ افسردگی سے بولا

یاجوج ماجوج ایک مرتبہ پھر دراز ہونے اور سونے کی کوشش کرنے لگے۔ مگر نیند کا کوسوں پتہ نہیں تھا۔ یاجوج کو جمائی کے ساتھ عجیب بیکلی ہو رہی تھی۔ بار بار اس کا منہ کھل جاتا اور زبان باہر نکل آتی۔ زبان کو وہ ہونٹوں پر پھیرتا۔ تالو سے رگڑتا۔ پھر منہ بند کر کے آنکھیں موند کے ساکت ہو جاتا۔ پھر اس کا منہ بند کر کے آنکھیں موند کے ساکت ہو جاتا۔ پھر اس کا منہ کھل جاتا اور وہ جمائی لیتا اور پھر زبان کو گردش دیتا۔ ہونٹوں پر پھیرتا۔ تالو سے رگڑتا۔ آخر اس سے نہ رہا گیا۔ بیکل ہو کے اٹھ کر بیٹھ گیا۔ ایک انگڑائی لی اور دیوار کی طرف چلا۔

"کہاں"، ماجوج نے ٹوکا۔

"یہ زمین تو آ نہیں رہی۔ میں نے سوچا کہ چلو چل کے دیوار ہی کو چاٹیں۔"

"فائدہ؟"

"فائدہ تو کچھ بھی نہیں ہے۔ ہماری ناتوان زبانیں اس اونچی ہیبت بھری دیوار کا کچھ نہیں بگاڑ سکتیں۔"

"پھر یہ لاحاصل عمل کیوں کیا جائے؟"

"یار مجھے تو اب سب ہی کچھ لاحاصل اور لایعنی نظر آتا ہے مگر یہاں سے بیگار بھگتی۔ کم از کم رات تو کٹے گی۔"

یاجوج نے قدم آگے بڑھایا، زبان نکالی اور دیوار کو چاٹنا شروع کر دیا۔ ماجوج بیٹھا تکتا رہا۔ دیوار چاٹتے یاجوج کو تکتے تکتے اس کی زبان میں کھجلی ہونے لگی۔ کیوں نہ میں بھی دیوار کو چاٹنا شروع کر دوں۔ یہ سوچ کر اس نے بھی زبان کی کھجلی تو جاتے گی۔ اور ماجوج بھی اپنی لمبی زبان کے ساتھ وہاں پہنچا اور دیوار کو چاٹنے لگا۔

رات ڈھلنے لگی تھی کہ یاجوج ٹھٹک کر ذرا سانس لینے کے لئے رکا۔ اس نے نظر بھر کر دیوار کو دیکھا اور بہت مطمئن ہوا۔ دیوار جتنی چٹا کر چلی دیتی تھی اس نے ماجوج کو ٹوکا۔ "دیکھتا ہے یہ دیوار کا تو اتنا ہم نے بھرکس نکال دیا ہے اب اس میں رہ گیا کیا ہے۔"

"ہاں ہم نے دیوار کو بہت چاٹ لیا ہے۔ مگر میں ڈر رہا ہوں۔" اس سے کہیں کچھ نہ ہو جائے۔

یاجوج تو پیشانی میں پڑ گیا۔ "یار تو خبط کہتا ہے مگر پھر کیا کیا جائے۔"

"ہم سوائے دعا کرنے کے کیا کر سکتے ہیں۔"

پھر یاجوج ماجوج نے ہاتھ اٹھا کر دعا کی "اے ہمارے رب تیری بخشی ہوئی لمبی دیوار کی رات ہمارے لئے بہت ہے صبح کے شر سے ہمیں محفوظ رکھ اور آیات کے فتنے کو دفع کر۔"

دیوار

"وہ تو ہنس رہا ہے۔"

"کیا؟" ایک دم سے سب کی نظریں جبران کے چہرے پہ مرکوز ہو گئیں۔

جبران نے ایک مرتبہ پھر کان لگا کر کچھ سننے کی کوشش کی۔ پھر بولا "ہاں بالکل۔ یہ تو ہنسی کی آواز ہے۔ وہ ہنس رہا ہے۔"

سب نے کان لگا کر اس دور کی آواز کو سننے کی کوشش کی اور اپنی ہراساں نظروں اور تشویش بھری خاموشی سے جبران کے بیان کی توثیق کی۔ صرف ایک عباس تھا کہ اس تشویش میں حصہ دار نہیں تھا۔ اس کی خاموشی تشویش کی بجائے بے تعلقی کا رنگ لیے ہوئے تھی۔ منہ سریں نے کان کے بیچ بڑا تھا اپنی تشویش کو اپنے وقار پر غلبہ نہیں پانے دیا۔ ایک وقار کے ساتھ کسی قدر افسردہ لہجہ میں بڑبڑایا "وہ کبھی ....." اور چپ ہو گیا۔

دفعتاً عمیر نے جھرجھری لی اور اٹھ کھڑا ہوا۔ رفیقوں نے اسی طرح چپ بیٹھے ہوئے استفسار آمیز نظروں سے اسے دیکھا۔

"میں خبر لے کر آتا ہوں۔" اور وہ چلا گیا۔

وہ سب اسی طرح چپ بیٹھے تھے۔ اب شام کا دھندلکا تھا۔ عمیر کا تعاقب کرتے ہوئے بھی ان کی نظریں زیادہ دور تک اسے نہیں دیکھ سکی تھیں اور اب اس کی راہ تکتے ہوئے بھی زیادہ دور تک نہیں دیکھ سکتی تھیں۔ مگر بڑھتا ہوا اندھیرا سماعت کی راہ میں حائل نہیں تھا۔ کان اسی طرح دور کی آواز پر لگے ہوئے تھے۔

"اب تو کوئی آواز نہیں آ رہی۔" عساہیل بولا۔

جبران نے تھوڑی دیر کان لگا کر سنا۔ عساہیل کی تائید کرتے ہوئے بولا "ہاں اب کوئی آواز نہیں آ رہی۔ لگتا ہے کہ اس نے ہمت نہ کر دیا۔"

پھر انہوں نے قدموں کی آہٹ سنی۔ دیکھا کہ عمیر واپس آ رہا ہے۔ کوئی کچھ نہیں بولا۔ کسی نے کچھ نہیں پوچھا۔ سوال ان کے ہونٹوں پر نہیں، آنکھوں میں تھا۔ تکتی ہوئی استفسار آمیز نظروں نے عمیر پر ترجمہ کر لیا۔

"وہ وہاں ہے ہی نہیں۔"

"کیا؟" ایک مرتبہ پھر سب چونک پڑے۔

"ہاں میرے عزیزو، وہ اب وہاں نہیں ہے۔ میں نے قریب جا کر اس لمبی فصیل پر ایک سمت سے دوسری سمت تک نظر ڈالی۔ وہ وہاں نہیں تھا۔"

"تو وہ کہاں گیا۔ . . ." مضطربین نے اپنے بزرگ سے پوچھا مگر وہ یہ کہہ کر خاموش ہو گیا۔

"مگر کہاں گیا وہ؟" عساہیل نے مضطرب ہو کر پوچھا۔

"جہاں اس سے پہلے جانے والے گئے تھے۔" مضطربین نے متانت کے ساتھ جواب دیا۔ اس کی متانت نے جیسے رفیقوں کے لبوں پر مہر لگا دی۔ سب چپ کے چپ رہ گئے۔ دیر بعد عساہیل بڑبڑایا "کتنے ہمارے رفیق اس راہ گئے اور گم ہو گئے۔ عجیب بات ہے کہ ہر رفیق جو کی خبر لے کر واپس آنے کا اعلان کر کے جاتا ہے، مگر وہ واپس۔ جو خبر لے کر ہی اس کی زندگی کو ناپاک ہے۔

ہے، پھر وہ ہماری طرف نہیں دوسری طرف دیکھتا ہے۔ قہقہہ لگاتا ہے اور دوسری طرف اتر جاتا ہے۔"

"دوسری طرف کیا ہے؟" عمار سہیل نے سوال اٹھایا۔

"دوسری طرف؟" سب نے حیران ہو کر سوالیہ نظروں سے دیکھا اور سوچ میں پڑ گئے۔ سوائے عمامہ کے۔

مندوبین نے عمامہ کو مطمئن دیکھا اور پوچھا "اسے عمامہ تو نے کچھ جانا کہ دوسری طرف کیا ہے۔"

"دوسری طرف جاننے کے لیے کچھ نہیں ہے۔"

"کچھ نہیں ہے؟ پھر آدمی ادھر کیا دیکھ کر ہنستا ہے۔" عمیر نے برہم ہو کر سوال کیا۔

"یہی دیکھ کر کہ وہاں دیکھنے کے لیے کچھ نہیں ہے۔"

عمیر نے اس پر تاؤ کھایا۔ کھڑے ہوتے ہوئے بولا۔ "میں دیوار پر چڑھوں گا اور خود دیکھ لوں گا کہ دیوار کے اس طرف کیا ہے۔"

رفیقوں نے حیران و پریشان نظروں سے اسے دیکھا کہ وہ دیوار کی طرف جانے کے لیے تیار کھڑا تھا۔

"تجھ سے پہلے جانے والے بھی یہی کہہ کر گئے تھے۔" عمامہ نے زہریلی ہنسی کے ساتھ کہا۔

"مگر میں واپس بھی آؤں گا۔" عمیر نے غصے سے کہا اور تیزی سے روانہ ہو گیا۔

عمیر جلد ہی آنکھوں سے اوجھل ہو گیا کہ وہ بہت تیزی سے چل رہا تھا اور شام کا اندھیرا گہرا ہونے لگا تھا۔ رفیقوں نے دیر تک اسے دیکھا اور پھر کان لگائے بیٹھ گئے ایک خوف بھرے انتظار میں کہ شاید وہی آواز جو وہ کئی بار سن چکے تھے پھر آئے۔

حیران نے خوف کے ساتھ کچھ سننے کی کوشش کی۔ پھر بولا "وہ دیکھی۔"

"کب؟ وہ دیکھی؟" رفیقوں نے چونک کر پوچھا۔

حیران نے باہر سیاہ پردے کی آواز پر کان لگائے "ہاں وہ دیکھی۔"

رفیقوں نے اپنے اپنے طور پر ہنسنے کی اس آواز کو سنا اور خوف بھری آواز میں بولے "وہ گئی"۔ پھر وہ آواز آنی بند ہو گئی۔ جبران نے بہت کان لگائے مگر کچھ سنائی نہ دیا۔ مایوسی سے بولا "اب کوئی آواز نہیں آ رہی"۔

"مطلب یہ ہے کہ گیا" منہ دیس نے کہا۔

"اور کیا مطلب ہو سکتا ہے"

دیر تک سب چپ بیٹھے رہے۔ آخر عباس نے جھرجھری لی۔ "کاش ہمارے پاس یا جوج ماجوج کی زبانیں ہوتیں"۔

"پھر کیا ہوتا؟" عباس نے بیزاری سے کہا۔

"پھر ہم اس دیوار کو رات رات میں چاٹ ڈالتے"۔

"مگر صبح کو وہ پھر کھڑی ہو جاتی" عباس نے اسی بیزاری سے کہا۔

"ہم اسے پھر چاٹ ڈالتے"۔

"اور اگلی صبح کو وہ پھر کھڑی ہو جاتی"۔

منہ دیس اپنے بزرگانہ انداز میں بیچ میں پڑتے ہوئے بولا کہ "عزیزو! آپس میں لڑو مت کرو۔ یہ سوچو کہ اس دیوار کے مسئلہ کا حل کیا ہو"۔

"بہتر ہے کہ ہم واپس ہو لیں" جبران بولا۔

عباس نے جبران کو گھور کر دیکھا "کیا کہا، واپس؟"

"ہاں واپس۔ ہمارا واپسی ہی میں عافیت ہے ورنہ یہ دیوار ہمارے سر ہمیشہ خرابی کرتی رہے گی"۔

"مگر واپسی ہمیں زیادہ خراب کرے گی"۔

"وہ خرابی اس خرابی سے بہرحال بہتر ہو گی کہ ہم بستی بستی دعوی اور اعلان کرتے دیوار سے چڑھیں اور پھر بے معنی ہنسی ہنستے ہوئے بغیر دیوار کے اس طرف اتر جائیں۔ آخر اس عمل سے حاصل؟"

منہ دیس نے ٹھنڈا سانس بھرا۔ سر جھکا دیا۔ پھر دیکھتے ہوں کہ اس دیوار نے ہمارے

درمیان دیواریں کھڑی کر دی ہیں۔ قبل اس کے کہ ہمارے درمیان دیواریں اونچی ہو جائیں۔ ہمیں اس مسئلہ کا حل تلاش کر لینا چاہیئے۔ سو عزیزو میں نے سوچا ہے کہ اب میں خود دیوار پہ چڑھوں گا۔"

"منہ دیکھتا تو!" سب نے چونک کر اسے دیکھا۔

"ہاں ہاں۔ میں دیوار پہ چڑھوں گا اور دوسری طرف کی خبر لاؤں گا۔"

"یہ وہی اعلان ہے۔" جبران بولا "جو آگے جانے والے کر کے گئے تھے۔ وہ یہ اعلان کر کے گئے اور واپس نہیں آئے۔"

"مگر میں نے واپسی کی ترکیب سوچ لی ہے۔"

"وہ کیا؟"

"میں نے ترکیب یہ سوچی ہے کہ ایک لمبی رسی لے کر اس کا ایک سرا میں اپنی کمر میں باندھوں اور دوسرا سرا تمہارے ہاتھ میں پکڑا دوں۔ پھر دیوار پہ چڑھوں۔ جب میں ہنسی کا شکار ہو جاؤں اور دیوار کے اس طرف زقند لگانے کے لیے ہمیں باندھوں تو تم مل کر رسی کو اپنی طرف کھینچو۔ یوں میں زقند لگانے سے باز رہوں گا اور خیریت سے واپس آؤں گا۔" عماسہ یہ سن کر بے ساختہ ہنسا مگر مندریس نے اس کی ہنسی سے چشم پوشی کی اور اپنے منصوبے پہ عمل درآمد کا اہتمام کیا۔ ایک لمبی رسی لے کر اس نے ایک سرا مضبوطی سے اپنی کمر میں لپیٹا اور گرہ لگائی۔ دوسرا سرا رفیقوں کے ہاتھ میں پکڑا دیا اور چلا دیوار کی طرف۔

دیوار پہ چڑھنے سے پہلے مندریس نے جبران اور عسامیل کو دیکھا کہ رسی کا سرا مضبوطی سے پکڑے ہوئے تھے پھر عماسہ کو دیکھا کہ الگ کھڑا تھا۔ "اے عماسہ! کیا تو اب بھی الگ تھلگ رہے گا اور مجھے دیوار کے اس پار گر جانے دے گا۔"

عماسہ نے تامل کیا۔ مگر پھر ایک الکساہٹ کے ساتھ آگے بڑھ کر رسی کو تھاما اور بولا کہ افسوس ہے تجھ پر کہ میں جانتا ہوں کہ یہ عمل کتنا بے معنی اور لاحاصل ہے اور پھر بھی اس میں شامل ہو رہا ہوں۔"

مندریس دیوار پر تیزی سے چڑھا۔ جبران اور عسامیل نے چشم زدن میں دیکھا کہ مندریس

دیوار کی منڈیر پر کھڑا ہے اور اس پار دیکھتا ہے۔ یہ دیکھ کر عساہیل پکارا کہ "اے مندریس کچھ کہہ تو نے دیوار کے اس پار کیا دیکھا؟"

جب ہیل کی پکار شام کے سناٹے میں صحرا میں گونجی اور گم ہو گئی عساہیل نے تعجب کیا کہ اس نے مندریس کو پکارا اور مندریس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ پھر جبران نے مندریس کو پکارا اور تعجب کیا کہ مندریس نے اس کی پکار کا بھی کوئی جواب نہیں دیا۔

"عجیب بات ہے مندریس ہماری پکار کو سن رہا ہے اور چپ ہے۔"

"مندریس اب نہیں بولے گا کہ اس نے دیوار کے اس طرف دیکھ لیا ہے۔" عماسہ بڑبڑایا۔

"مگر" جبران چونکا "مگر وہ ہنس رہا ہے۔"

"کیا" عساہیل نے کان کھڑے کیے "مندریس ہنس رہا ہے۔"

دونوں نے کان لگا دیے اور حیران اور خوف زدہ ہوئے مندریس نے بھی جس پر وہ بیٹھے بیٹھے ہنسنا شروع کر دیا تھا۔

"کیا مندریس بھی؟" جبران نے تشویش سے کہا۔

"نہیں۔ مندریس کو ہر حال میں واپس آنا ہے کہ وہ رسی سے بندھا ہوا ہے اور رسی کا سرا ہم نے مضبوطی سے پکڑ رکھا ہے۔"

"مگر عساہیل، میری مٹھی بھاری ہوتی جا رہی ہے۔"

"اے جبران، رسی کو مضبوطی سے تھامے رہ کہ اسی طرح ہم مندریس کو دوسری طرف نہ گرنے سے باز رکھ سکتے ہیں۔"

عساہیل اور جبران نے اور ان کے ساتھ عماسہ نے رسی کو مضبوطی سے تھاما۔ مندریس پہلے آہستہ ہنسا، پھر اس کی ہنسی کی آواز تیز ہوتی چلی گئی حتیٰ کہ ایک لمبا قہقہہ بن گئی۔ عساہیل، جبران اور عماسہ نے ایک لمبے قہقہہ کو ایک خوف کے ساتھ سنا اور ان کی مٹھی بھاری ہوتی چلی گئی۔

"عزیزو! رسی کو اپنی طرف کھینچو۔ مبادا ہم خود دیوار پر کھنچے چلے جائیں۔" عساہیل بولا۔

رسی کو اپنی طرف انہوں نے پوری طاقت سے کھینچا اور محسوس کیا کہ انہوں نے مندریس کو اپنی طرف گھسیٹا ہے۔ پر جب انھوں نے قریب جا کر دیکھی تو حیرت اور خوف سے ان کی آنکھیں کھلی رہ گئیں۔ جبران بولا "عزیزو، یہ ہم کیا دیکھتے ہیں کہ مندریس آدھے دھڑ کی صورت خون میں لت پت پڑا ہے، یہ آدھا دھڑ کہاں گیا۔"

"مجھے لگتا ہے کہ کھینچا تانی میں آدھا دھڑ ہماری طرف آپڑا۔ آدھا دھڑ دوسری طرف جا پڑا۔"

جبران نے عساہیل کی یہ بات سن کر تامل کیا۔ پھر عماسہ سے مخاطب ہوا "اے عماسہ تو اس باب میں کیا کہتا ہے؟"

عماسہ ہنسا۔ "مندریس نے ایک شوق فضول میں اپنے وجود کو کتنا مضحکہ خیز بنا لیا ہے کہ وہ آدھا ادھر پڑا ہے۔ آدھا دیوار کے اس طرف۔"

عساہیل نے خون میں لت پت ادھورے مندریس کو دیکھا اور درد کے ساتھ کہا "کاش ہمارے پاس یاجوج ماجوج کی زبانیں ہوتیں۔"

"پھر کیا ہوتا" عماسہ نے جل کر کہا۔

"پھر ہم اس دیوار کو رات رات میں چاٹ ڈالتے۔"

"مگر صبح کو وہ پھر کھڑی ہو جاتی۔"

"ہم پھر سے رات رات میں چاٹ ڈالتے۔"

"اور صبح کو وہ پھر کھڑی ہو جاتی۔" عماسہ نے جلے کٹے لہجہ میں کہا اور زہر میں بجھی ہنسی ہنسا۔ پھر وہ ہنستا چلا گیا۔

جبران اور عساہیل دونوں سکتے میں آ گئے۔

"عماسہ بھی" جبران اس سے آگے کچھ نہ کہہ سکا۔

"اور وہ تو دیوار پر بھی نہیں چڑھا ہے۔" عساہیل نے تعجب سے کہا۔

جبران اور عساہیل دونوں حیرت و دہشت سے عماسہ کو تکے چلے جا رہے تھے جس کی ہنسی اونچی ہوتے ہوتے اب ایک لمبا قہقہہ بن چکی تھی۔

خواب اور تقدیر

ناقوں پر سوار چپ سادھے سانس روکے ہم دیر تک اس راہ چلتے رہے حتیٰ کہ آگے آگے چلتے ہوئے ابوطاہر نے اپنے ناقے کی نکیل کھینچی اور اطمینان بھرے لہجہ میں اعلان کیا "ہم نکل آئے ہیں"۔

"نکل آئے ہیں؟" ہم تینوں نے تعجب اور بے یقینی سے ابوطاہر کو دیکھا "رفیق کی ہمشیرہ کے کہے پر اعتبار کریں؟"

اور ابوطاہر نے اعتماد سے جواب دیا "قسم ہے اس کی جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے ہم شہر بے وفا سے نکل آئے ہیں"۔

پھر بھی ہم نے تصدیق کی۔ گھبرائی پھٹی پھٹی نگاہوں سے دگرد و پیش کا جائزہ لیا۔ کوئی شے جانی پہچانی نہ در و دیوار واقعی قدموں سے اوجھل تھے۔ یہ گرد و پیش ہی اور تھا۔ تب ہمیں یاد آیا کہ ہم نکل آئے ہیں۔ بس فرط اپنے ناقوں سے فرط مسرت سے ریت پر گر پڑے اور اپنے پیدا کرنے والے کا شکر ادا کیا۔ پھر ناقے کے کجاوے کے

سائے میں بیٹھے کر اپنے توشے کو کھولا۔ ایک ایک مٹھی ستو پھانکے اور ٹھنڈا پانی پیا۔ اس ساعت میں ٹھنڈا پانی ہمیں کتنا ٹھنڈا اور میٹھا لگا۔ لگتا تھا کہ ہم پیاسوں نے آج ایک زمانے کے بعد پانی پیا ہے۔ خدا کی قسم اس آفت زدہ شہر میں تو غذائیں اپنا ذائقہ کھو بیٹھی تھیں۔ اور ٹھنڈے میٹھے کنوئیں یکقلم کھاری ہو گئے تھے۔ یا شاید ہم اتنے بے مزہ ہو گئے تھے کہ اللہ تبارک و تعالیٰ کی پیدا کی ہوئی نعمتیں ہمارے لئے بے لذت ہو گئی تھیں۔

یہ سب کچھ اس شخص کے وارد ہونے کے بعد ہوا۔ وہ شخص بالا قد گھوڑے پر سوار سیاہ عمامہ پہنے منہ پر ڈھاٹا باندھے ڈھال تلوار زیب کمر کئے شہر میں داخل ہوا۔ لوگ سمجھے کہ امام زماں کا ورود ہوا۔ گلی گلی کوچہ کوچہ یہ خبر پھیلی۔ لوگ مسرور ہوئے۔ امام کے تصور سے مسحور ہوئے مرحبا کہتے گھروں سے نکلے اور اس کے گرد اکٹھے ہوئے کس شان سے سواری قصر الامارہ کی سمت چلی۔ لگتا تھا کہ پورا شہر امڈا ہوا ہے۔

قصر الامارہ کے اونچے دروازے پر پہنچ کر اس نے گھوڑے کی باگ کھینچی اور مجمع کی طرف رخ کیا۔ رخ کرتے کرتے دفعتاً ڈھاٹا کھولا۔ خوانخوار صورت کف در دہان۔ نیام سے شمشیر نکالی اور کڑک کر کہا کہ اے لوگو۔ تم میں سے جو جانتا ہے وہ جانتا ہے جو نہیں جانتا وہ جان لے کہ میں آگیا ہوں۔ سب سناٹے میں آگئے وہ بھی جنہوں نے دیکھا اور جانا کہ کون ہے جو آیا ہے وہ بھی جنہوں نے دیکھا مگر نہ جانا کہ کون ہے جو آگیا ہے۔

اس نے اپنا اعلان کیا اور قصر الامارہ کے اندر چلا گیا۔ لوگ دیر تک ساکت کھڑے رہے۔ آخر کو ابو المنذر نے سکوت توڑا۔ افسوس بھرے لہجے میں بولا کہ شہر کوفہ پر خدا رحمت کرے۔ "تنفر اس نے کس کے لیے کھینچا تھا اور وارد کون ہوا؟"

"کون ہے جو وارد ہوا ہے"۔

"اے لوگو۔ تف ہے تم پر کہ ابھی تک تم نے نہیں پہچانا کہ یہ کس باپ کا بیٹا ہے۔ کس باپ کا جس کا باپ نہیں تھا اور جسے لونڈی نے جنا تھا"۔

"زیاد کا بیٹا!" بے اختیار کسی کی زبان سے نکلا۔ اور ایک دفعہ پھر سب سناٹے میں آ گئے۔

اس کے آنے کی خبر پھیلتی گئی اور کوچے اور خیابان خالی، اور خاموش ہوتے گئے۔ میں منصور بن نعمان الحمیدی کبھی کوچوں سے گذر کر قصر امارہ تک پہنچا تھا اور خالی خیابانوں اور خوف کرتے کوچوں سے گذر کر واپس گھر پہنچا اور جب اس بے آرام رات کے بعد صبح ہوئے میں گھر سے نکلا تو دیکھا کہ شہر بدل چکا ہے۔ خدا کی قسم میں نے اس شہر کو بھٹی پہ چڑھے کڑھاؤ کی مثال ابلتے دیکھا تھا۔ اب میں اسے سیٹھ ال ہوس کی صورت ٹھنڈا دیکھ رہا تھا۔ اور میں دل میں رویا کہ شہر کس شورے سے اٹھتے ہیں اور کتنی سرعت سے ڈھے جاتے ہیں۔

میں گرفتہ دل اپنے رفیق دیرینہ مصعب ابن بشیر کے پاس پہنچا۔ گلوگیر ہو کر کہا اے مصعب "تم نے دیکھا کہ کوفہ آن کی آن میں کتنا بدل گیا ہے۔"

مصعب نے مجھے گھور کے دیکھا اور کہا کہ "اے منصور! تعجب مت کر اور آہستہ بول۔"

میں نے اسے تعجب سے دیکھا "رفیق کیا تو وہ نہیں ہے جو کل اونچی آواز سے بول رہا تھا۔"

وہ بولا "کل سب سے اونچی آواز میں ابو المنذر بولا تھا اور آج وہ قصر الامارہ کی دیوار تلے ٹھنڈا پڑا ہے۔"

یہ کہہ کے وہ رفیق مجھ سے شتابی سے رخصت ہوا اور قصر الامارہ کی طرف چل گیا۔

تب میں نے جانا کہ کوفہ واقعی بدل چکا ہے اور واقعی مجھے آہستہ بولنا چاہیئے۔ بلکہ نہیں بولنا چاہیئے۔ قیس بن مسہر کو میں نے دیکھا کہ وہ بولا اور ہمیشہ کے لیے چپ ہو گیا۔ ابن زیاد کے آدمی اسے پکڑ کر قصر الامارہ کی چھت پر لے گئے۔ کہا کہ بول کیا بولتا ہے۔ اس نے اونچی آواز میں اپنا علان کیا کہ اس خاموش شہر میں بھی میں اس کی آواز سنی گئی۔ دوسرے ہی لمحے اسے چھت سے نیچے دھکیل دیا گیا۔ قصر الامارہ کی دیوار تلے کتنی دیر وہ سسکتا رہا۔ دیر بعد اس کا دوست عبدالمومن بن عمیر اس راہ سے گذرا اور اپنا خنجر نکال کر اس کے گلے پر پھیر دیا۔ ایک بوڑھے نے سرگوشی میں اس سے

کہا کہ تو نے خوب حق دوستی ادا کیا۔ اور اس نے سکت جواب دیا کہ میں اپنے عزیز دوست کو سسکتا ہوا نہیں دیکھ سکتا تھا۔

میں یہ نقشہ دیکھ وہاں سے پھرا اور خیاباں خیاباں پریشان پھرتا پھرا۔ لگ رہا تھا کہ میں کوفے میں نہیں ہوں۔ خوف کے صحرا میں بھٹک رہا ہوں۔

خوف کے صحرا میں بھٹکتے بھٹکتے میری مڈھ بھیڑ ابوالماہر سے ہوئی اور ابوالماہر نے مجھے جعفر رسیعی اور ہارون ابن سہیل سے ملایا۔ کتنے دنوں تک ہم چاروں گونگے بہرے بنے اس خوف کے صحرا میں بھٹکتے پھرے۔ آخر کے تئیں ہم نے صبر کا دامن ہاتھ سے چھوڑا۔ سر جوڑ کر بیٹھے اور سوچا کہ کسی صورت یہاں سے نکل چلیے۔ اس تجویز پہ جعفر رسیعی رو پڑا۔ بولا "میں کوفے کی مٹی ہوں۔ اس مٹی کو کیسے چھوڑ دوں"۔

ہارون ابن سہیل بولا "ہر چند کہ میں مدینہ کی مٹی ہوں مگر پالنے والے کی قسم اس قرئے سے مفارقت مجھے بھی رلا دے گی کہ میں نے اپنی جوانی کے ایام اسی شہر کے کوچوں میں گذارے ہیں۔

تب ابوالماہر نے کہا کہ ہم میں سب سے بڑا تھا میری طرف دیکھیں "اے منصور۔ تو اس باب میں کیا کہتا ہے"۔

میں نے عرض کیا کہ "رفیقو حضور کی یہ حدیث یاد کرو کہ جب تمہارا شہر تم پہ تنگ ہو جائے تو وہاں سے ہجرت کر جاؤ"۔

یہ کلام سن سب رفیق قائل ہو گئے اور نکل چلنے کی تیاریاں کرنے لگے۔

ہم نے شہر سے نکلنا کتنا آسان جانا تھا مگر کتنا مشکل نکلا۔

شہر کے دروازوں پر پہرہ تھا۔ آتے جاتے والوں پہ روک ٹوک تھی۔ کتنی مرتبہ ہم دونوں دروازوں تک گئے اور پہرے داروں کو چوکس دیکھ کر چپکے سے واپس پیچھے آ گئے۔ کوفہ ہم پر تنگ ہوتا جا رہا تھا۔ تنگ ہوتے ہوتے چوہے دان کی مثال بن گیا۔ جس کے اندر ہم ایسے پھنسے تھے [illegible] کہ چکر کاٹیں اور نکلنے کی راہ نہ پائیں۔

نکلنے کی کوئی صورت نہ دیکھ کر ہم بھی جان سے بیزار ہوتے ہوئے ہاروں ابن ہبیل نے لمبی آہ کھینچی اور کہا کہ "کاش ہمارے دل بجھ ہو جاتے۔ اور ہمارے باپوں کے نطفے ضائع ہو جاتے کہ نہ ہم پیدا ہوتے نہ ہمیں یہ سب دن دیکھنے پڑتے۔"

"بلاشبہ یہی مدینہ رسول" دائے ہو ہم پر کہ اپنے ہی قرشی بھائیوں نے ہمیں گھیر لیا ہے اور دائے ہو اس قریشی پر کہ وہ اپنے بھائیوں کے لیے سوتیلی ماں بن گیا۔"

پاس کی اس انتہا پر پہنچ کر ہم بے حس بن گئے۔ مزید کچھ نہ کرنا۔ بس کمر ہمت باندھ چل کھڑے ہوئے کہ ہر چہ باداباد۔ معلوم نہیں یہ کیسے ہوا کہ ہم سب کی آنکھیں پر پردے پڑ گئے۔ نیند آ گئی۔ بہرحال ہم اب شہر سے باہر تھے اور آزاد فضا میں سانس لے رہے تھے۔

شام کے سائے بڑھتے جا رہے تھے اور ہوا گرم سے ٹھنڈی ہونے لگی تھی۔

"ہمنفسو رات کالی ہے اور سفر لمبا ہے۔"

"اے اخی! کیا یہ رات کوفے کے دنوں سے زیادہ سیاہ ہے؟"

یہ دلیل سب کو قائل کر گئی۔ ہم اس دھندلی کالی ہوتی رات میں بغیر کسی کے گھر میں کس کر ہو گئے۔

"مگر جانا کہاں ہے؟"

اس سوال نے ہمیں چونکایا۔ ہم تو بس نکل کھڑے ہوئے تھے۔ یہ تو سوچا ہی نہیں تھا کہ جانا کہاں ہے۔

ابوعمر نے تامل کیا۔ پھر کہا "مدینے۔" "اور کہاں؟"

"بس اور جعفر۔" بھتیجی اس تجویز کے حوالے ہو گئے۔ مگر ہارون ابن ہبیل سوچ میں پڑ گیا۔ "جب تک ہم وہاں پہنچیں گے اگر وہ بھی کوفہ پہنچ چکا ہو تو؟"

ہم سب نے اسے برہمی سے دیکھا۔

"اے رفیق، جعفر بھتیجی ہے۔ ہم مشورہ شہر تک پہنچ چکے۔ وہ خود وہاں کی

ہے ایسا سوچنا ہے۔"

ہارون بن سہیل رکا۔ پھر بولا "ہمنفسو بیشک اس شہر مبارک کی زمین آسمان سے۔ یہاں کی مٹی معنبر اور پانی مصفا ہے مگر میں اس شہر کی سمت سے آنے والوں سے ملا ہوں۔ میں نے انہیں پریشان پایا۔"

اس پر ہم چپ ہو گئے۔ کسی سے کوئی جواب نہ بن پڑا۔ مگر ہارون بن سہیل بھی چپ نہیں ہوا تھا۔ سوچتے سوچتے بولا "ہمنفسو۔" میں سوچتا ہوں اور حیران ہوتا ہوں کہ نور حق سے منور ہونے والے شہر کتنی جلدی منقلب ہو گئے۔ کتنی جلدی ان کے دل پراگندہ اور ایمان پریشان ہو گئے۔"

ابوطاہر نے بے برہمی سے کہا "اے سہیل کے ناخلف بیٹے، تیری ماں تیرے سوگ میں بیٹھے۔ کیا تو اسلام کی حقانیت سے انکار کرے گا۔"

ہارون بن سہیل بولا "بزرگ، میں پناہ مانگتا ہوں اس دن سے کہ میں خدائے بزرگ و برتر کی وحدانیت میں شک کروں اور اسلام کی حقانیت سے انکار کروں مگر یہ کہ کوفہ...."

ابوطاہر نے غصے سے اس کی بات کاٹی "کوفہ کیا؟ کیا کہنا چاہتا ہے تو؟"

"ہاں یہی میں سوچتا ہوں کہ کوفہ کیا اور کیوں؟ بار بار اس خیال کو دفع کرتا ہوں اور بار بار یہ خیال میرا دامنگیر ہوتا ہے کہ مبارک قولوں کے بیج کوفہ کیسے نمودار ہو گیا۔ اور کتنی جلدی نمودار ہوا۔ ہجرت کو بھی ایسا کونسا زمانہ گذر گیا ہے۔"

میں نے دیکھا کہ ابوطاہر کے مزاج کی برہمی بڑھتی جا رہی ہے۔ میں نے بات بیچ میں کاٹی اور کہا "رفیقو میری تجویز یہ ہے کہ اس شہر چلیں جسے حق تعالیٰ نے شہر امن قرار دیا ہے۔ بیشک دنیا ظالموں سے بھر جائے اور زمین فساد سے تہ و بالا ہو جائے مگر مکہ کے مبارک شہر کے امن میں خلل نہیں آئے گا۔"

سب رفیقوں نے میری اس تجویز پر صاد کیا اور ہم فوراً ہی ناقوں پر سوار ہو گئے۔

تاریکی بہت تھی کہ یہ چاند کے شروع کی راتوں میں سے ایک رات تھی۔ کھجور کے درختوں میں کھینچے لیے جا رہے تھے۔ سب رات بھیگ چکی تھی اور آسمان سے نرمی خنکی نے ہمارے دلوں میں ترنگ پیدا کر دی تھی۔ شہر من کے تصور میں مگن ... تھے۔ ... جا رہے تھے۔ ناقہ پر بیٹھے بیٹھے اونگھ آ گئی میں نے کیا دیکھا کہ میں خیمہ میں نیک پاک بزرگوں کے بیچ بیٹھا ہوں اور کوفہ کا حوال سنتا ہوں۔ اچانک کان میں ایک آواز آئی "یہ تو ہم پھر وہیں آ گئے" اور میں نے ہڑبڑا کر آنکھیں کھولیں۔ یہ تڑکے کا وقت تھا اور ہم کوفے کے در و دیوار نظر آ رہے تھے۔

"یہ تو ہم پھر وہیں آ گئے" جعفر ربیعی کہہ رہا تھا۔

ابوطاہر نے ہارون بن سہیل نے حیرت و دہشت سے بھری نظروں سے ان در و دیوار کو دیکھا۔

"مگر کیسے؟" میرے منہ سے نکلا۔

ابوطاہر نے تامل کیا اور کہا "رفیقو ربیعی اب کہتا ہے کہ پہرے والوں نے ہمیں دیکھ لیا ہے، شاید قافلہ کو ہمارا یہاں سے نکلنا منظور نہیں"۔

ہارون بن سہیل نے ٹھنڈا سانس بھرا اور کہا "کوفہ ہماری تقدیر ہے"۔

اور میں منصور بن نعمان عدیدی قصہ دہرا کر بولا "یاں مکہ ہمارا خواب ہے، تقدیر ہماری کوفہ ہے"۔

اور ہم تھک ہار کر واپس کوفے میں آ گئے۔

○

صبح کے خوش نصیب

سب لوگ اپنی جگہ پر بیٹھے تھے اور گاڑی رکی کھڑی تھی۔ کمشنر مرتضیٰ خان ہوا کہ گاڑی اب چلی
مگر نہیں چلی۔ کمشنر مرتضیٰ گاڑی سے باہر نکلے ہوئے مسافر سیٹی دیتے انجن سے اشارہ لیکر پھر
جھپک کر واپس اپنی اپنی نشست پر آ گئے اور دم سادھ کر بیٹھ گئے کہ اب گاڑی چلے گی۔ دم
سادھے بیٹھے رہے اور منتظر رہے کہ کب گاڑی حرکت میں آئی ہے۔ گاڑی حرکت میں نہ آئی
نہ ہی نہیں۔ آئی تو بس اس قدر کہ پہیے مشکل سے تھوڑا گھومے اور ڈبوں کو تھوڑا جھٹکا لگا
مگر پہیے پورا چکر لینے سے پہلے ہی رک گئے اور گاڑی ایک ٹک نظر کی سے بعد پھر ساکت ہو گئی
بیٹھے رہے، بیٹھے رہے۔ پھر کسی نے بے اطمینان ہو کر سیٹی بجائی۔ کوئی بیزار ہو کر اٹھ
کھڑا ہوا۔ ایک ایک کر کے پھر گاڑی سے اترنے اور پٹڑی پر چہل قدمی کرنے لگے۔ کسی نے پٹڑی
کو پکڑا اور دوستوں کے سامنے بیٹھ گیا۔

ایک گاڑی کی بوگی سے نیچے اتر کر بچے نے بور ہو کر ماں سے سوال کیا۔

"چلے گی؟"

"کب چلے گی؟"

"بس ابھی چلے گی۔"

مگر وہ کمسن ماں سے یہ جواب پہلے بھی سن چکا تھا۔ بیدلی سے اس نے سنا اور باہر تکنے لگا۔

سامنے کی نشست پر بیٹھی ہوئی عورت نے گود کے بچے کو پہلے خالی باتوں سے بہلانے کی کوشش کی۔ جب وہ نہ مانا اور سینے پر دست درازی کرنے لگا تو اس نے قمیص کا دامن کھول کر بچے کا منہ اندر کیا اور دامن گرا لیا۔ قمیص کا دامن اس نے اتنی چابکدستی سے اٹھایا کہ بس کے بے معنی سے گوشے کے سوا کچھ نظر نہیں آیا۔ خیر اس سے اتنا پتہ تو چل ہی گیا کہ اس سنگلاخ لباس کے اندر کتنا روشن بدن چھپا ہوا ہے۔

میرے برابر کی نشست پر بیٹھے ہوئے بڑے میاں جو بڑی یکسوئی سے اخبار پڑھ رہے تھے پڑھتے پڑھتے تھک گئے۔ بالآخر اخبار پڑھنے پر تھک گئے۔ اخبار کو ایک طرف رکھا اور بڑبڑائے "بہت دیر ہو گئی۔ آخر کاٹھ کی گاڑی کیوں نہیں چل رہی؟"

"کوئی گڑبڑ ہوئی ہے۔" قریب میں بیٹھا ہوا برائیف کیس والا آدمی بولا

"میرے خیال میں تیز گام آ رہی ہے۔" دوسرے نے ٹکڑا لگایا۔

"تیز گام؟" برائیف کیس والے نے کلائی پر بندھی خوبصورت گھڑی کو دیکھا "تیز گام کا تو یہ وقت نہیں ہے۔"

"پھر اور کوئی گاڑی ہو گی۔"

"ہاں اور کوئی گاڑی ہو گی۔ مگر بڑی دیر لگائی۔"

"بس یہی بات کے ساتھ یہی ہوتا ہے۔ چیونٹی کی چال چلتی ہے اور قدم قدم پر رکتی ہے۔"

بس کی کھڑکیوں کی قطاریں اب ان پر کھل رہی تھیں سوار ہوتے وقت تو وہ اینٹیں کتنی نظر آ رہی تھیں۔ پلیٹ فارم پر کتنا ہجوم تھا کتنی دھکم پیل کے ساتھ وہ گاڑی پر چڑھے

رہے تھے اور سیٹ لینے کے لیے ایک دوسرے پر گر رہے تھے۔ ایک دوسرے کو دھکیل رہے تھے، ایک دوسرے سے الجھ رہے تھے۔ جو اندر داخل ہو گئے تھے ان کی سر توڑ کوشش تھی کہ اب کوئی اندر نہ آئے۔ جو باہر رہ گئے تھے وہ سر توڑ کوشش کر رہے تھے کہ کسی طرح اندر داخل ہو جائیں۔ اندر داخل ہو جانے والوں نے کتنی پھرتی سے اپنے ڈبے کے دروازے بند کئے تھے۔ اور بعد میں آنے والوں نے کتنے زور کے ساتھ دروازے کھلوائے تھے اور سامنے آنے والوں کو دھکے دیتے ہوئے بستروں اور بکسوں کو پھلانگتے ہوئے نشست کی تلاش میں بڑھتے چلے جا رہے تھے۔ کتنی دھینگا مشتی کے بعد کبھی بیٹھنے کی اور کبھی محض کھڑا ہونے کی جگہ میسر آئی۔ پھر جب گاڑی چلی تو ہم سوار ہو جانے والوں نے اپنے آپ کو کتنا خوش نصیب اور پیچھے رہ جانے والوں کو کتنا بدنصیب جانا تھا۔ پھر یکایک پیچھے رہ جانے والوں کے لئے ہمارے یہاں کتنی ہمدردی کا جذبہ پیدا ہو گیا تھا۔ چلتی ہوئی گاڑی کے ساتھ دوڑتے دوڑتے اگر کوئی سنڈاس پکڑ کے لٹک گیا تو کسی نہ کسی نے جلدی سے اس کے لئے دروازہ کھول اور اسے اندر آنے کی راہ دے دی۔ پھر چلتی ہوئی گاڑی سے ہم نے اک گونہ اطمینان کے ساتھ اپنی اپنی کھڑکی سے باہر جھانک کے دیکھا۔ پلیٹ فارم پہ کھڑے رہ جانے والے مسافر کتنے بے آسرا اور کتنے قابل رحم نظر آ رہے تھے۔

اب پہیہ ان گھومنے لگا تھا۔ اس گاڑی کے مسافر ہونے کی بنا پہ ہم اپنے آپ کو کتنا بے آسرا کتنا قابل رحم سمجھ رہے تھے۔ اور وہ جو گاڑی میں سوار نہ ہو سکے، اچھے رہے وہ لوگ جو اس گاڑی میں سوار ہوتے ہوتے رہ گئے۔

"میری سیٹ تو جہاز میں بک تھی" بریف کیس والا بولا "لیکن پروگرام میں تبدیلی کی وجہ سے مجھے اپنی سیٹ کینسل کرانی پڑی۔ اس کے بعد کسی فلائٹ میں کوئی سیٹ نہیں ملی۔ سوچا کہ ٹرین پکڑی جائے۔ تیز گام، سوپر کسی میں سیٹ نہیں ملی۔ آخر کو پسنجر میں بیٹھنا پڑا۔"

ایک دفعہ پھر مسافر تیزی کے ساتھ اندر آئے اور اپنی اپنی نشست پر آکر بیٹھ گئے۔ بس میں ابھی ابھی انجن نے سیٹی دی تھی۔

"گاڑی اب چلنے لگی ہے" کہنے والے کے لہجہ میں دبی دبی خوشی کا رنگ شامل تھا

"واقعی؟"

"ہاں بس چلنے والی ہے۔ انجن نے سیٹی دے دی ہے۔"

"اللہ تیرا شکر ہے۔"

"کمبخت ٹریفک نے جھانک کر دیکھا، امی دیکھو۔"

"کیوں، کیا بات ہے۔"

"دھواں۔" اس نے انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

امی نے باہر جھانک کر دیکھا۔ میں نے بھی باہر جھانکا۔ واقعی انجن نے جھانک کر زور شور سے دھواں اگلنا شروع کر دیا تھا۔ سیٹی ہی سے تمہیں اس دھوئیں سے بھی شاید مسافروں نے یہ اشارہ دیا تھا کہ بس اب گاڑی چل پڑے گی۔ انجن کے منہ سے سیاہ کالا دھواں اگلتا ہے تو اس کی بات اور ہوتی ہے فضا میں کالوں کی بکھیر کر پھیلتی اور سمٹتی چلی جاتی ہے مگر جب کھڑا ہوا انجن دھواں اگلتا ہے تو فضا کی پاکیزگی کے لئے خطرہ بن جاتا ہے۔

انجن نے دھواں اگلتے ہوئے ایک دفعہ پھر سیٹی دی اتنی تیز کہ پورے جنگل میں گونج گئی۔ جنگل میں بھی اور مسافروں کے دلوں میں بھی جیسے سیٹی کی آواز سے گرہ لگتے ہوں وہ جو ایک بے چینی چھائی ہوئی تھی وہ کافور ہو گئی۔ سب مطمئن اپنی نشست پر بیٹھ گئے۔ لگ رہا تھا کہ گاڑی اس وقت میں آنے والی ہے۔

بیٹھے رہے، بیٹھے رہے۔ پہیوں نے بالکل پہلے کی طرح ایک ہلکی سی جنبش کی تھی۔ اور اس سے ایک تکلیف بھری آواز بھی پیدا ہوئی تھی جیسے پہیوں کو گردش کرنے میں تکلیف

ہو رہی ہو۔ مگر پھر وہی سکتہ۔ اور اب تو دھوئیں کا زور بھی کم ہوتا جا رہا تھا۔ کالے سے بھورا ہوا اور پھر بالکل ہی معدوم ہو گیا۔

جب گاڑی کسی طور حرکت میں نہ آئی تو پھر وہی بیزار سی۔ بڑے میاں نے بور ہو کر پھر اخبار اٹھایا۔ اور پڑھی ہوئی خبروں کو پڑھنا شروع کر دیا۔ سامنے بیزار گود میں بچہ پھر کلبلایا۔ اور اس نے اس مرتبہ اتنی بیزاری اور بے پرواہی سے تھپیں اوپر اٹھائی کہ دم بھر کے لیے تو پیٹ سے اوپر کا ہر اکھڑا منظر بھی نمایاں ہو گیا۔

"گاڑی آج نہیں چلے گی۔" کسی نے بیزار ہو کر کہا۔

"اوہ گاڑی نہیں چلے گی۔" کمسن لڑکے نے خوفزدہ ہو کر پوچھا۔

"چلے گی بیٹے۔"

"کب چلے گی؟"

"بس تھوڑی دیر میں چلے گی۔"

کمسن لڑکے نے بے اعتباری سے ماں کا جواب سنا اور پھر باہر دیکھنا شروع کر دیا۔

"شام ہو رہی ہے۔ کیا مسافر ہے۔" چھانگے ہوئے کہا۔

ہاں واقعی۔ وہ وسیع و عریض میدان اور عجیب و غریب تھوڑی دیر پہلے تک دھوپ میں چمک رہے تھے یہ چھاؤں میں آ گئے تھے۔ درختوں پر پھیلنے کے ساتھ ساتھ جیسے اداسی پھیلتی جا رہی ہو۔

"رات کہیں اسی جنگل میں نہ گذارنی پڑ جائے۔"

"اس جنگل کا راستہ ہے۔ ان میں بھی محفوظ نہیں۔ رات گذارنی پڑی تو۔۔۔۔۔"

وہ جتنے آتے رہے۔ مگر اس کے تشویش بھرے لہجہ نے سب کچھ کہہ دیا تھا۔

بڑے میاں نے اخبار سے نظریں اٹھا کر کہنے والے کی صورت دیکھی۔ پھر اخبار ایک طرف ڈال کر منہ ہی منہ میں کوئی آیت پڑھی۔ "اللہ انت سبحانک۔۔۔۔۔ چپ

ہوئے۔ پھر انہوں نے بولنے والوں کی طرف سے منہ پھیر کر مجھے اپنے خطاب کے لیے چنا۔

"بیٹے تم کہاں جا رہے ہو؟"

"یہ سوال بے محل ہے"

انہوں نے غور سے میری صورت دیکھی "بے محل کیسے ہے؟"

"ہم یہیں سے کہاں جا رہے ہیں، یہ تو بعد کی بات ہے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ ہم یہاں سے کب نکل رہے ہیں؟"

"اور نکل بھی رہے ہیں یا نہیں" کسی قریب بیٹھے ہوئے نے ٹکڑا لگایا۔

اسی گفتگو کا ردعمل ابھی سفید وردی میں گزرتا نظر آیا۔ ایک مسافر سے دیکھ کر پھرتی سے اٹھا اور گاڑی سے اتر گیا۔ تھوڑی ہی دیر بعد واپس آ گیا۔ سب نے سے متجسس نظروں سے دیکھیں۔

"یہ گارڈ تھا؟"

"ہاں"

"بات سے گاڑی کیوں نہیں چل رہی؟"

"آگے گڑبڑ ہے"

"یہ خیال ہے" جانب کیبن والا بولا "آگے کوئی حادثہ ہو گیا ہے۔ نہیں تو گاڑی اتنی دیر نہیں رک سکتی تھی"

"ہو تو سکتا ہے ہو جاتا"

"اتنی دیر"

"ہاں، اور اتنی گاڑی کے ساتھ ہوتا" وہ تو یہ رفتہ رفتہ چل پڑ گیا۔

"اچھا، کیا بات تھی؟"

"آگے پٹری کھڑی ہوئی ہے"

"پھر تو بچ گئے"!

"ہاں یہاں سے نکل جائیں پھر جانیں"!

ہاں واقعی میں نے سوچا پہلے یہاں سے تو نکلیں۔ اور اسی کے ساتھ مجھے پھر اس گاڑی کا خیال آیا جس میں ہم اس گاڑی میں سوار ہوئے تھے۔ ہم گاڑی میں بیٹھے لوگ اس طرح ایک احساس تحفظ کے ساتھ ان پر ترس کھا رہے تھے جو پیچھے رہ گئے تھے۔ اب وہ ہم پر ترس کھائیں گے۔ خوش نصیبی اور بدنصیبی کا کتنی جلدی آپس میں تبادلہ ہو گیا۔ صبح کے خوش نصیب شام ہوتے ہوتے بدنصیب بن چکے ہیں۔ پیچھے رہے وہ لوگ جو گاڑی میں سوار نہ ہو سکے اور ایک دفعتی بدقسمتی سے گذر کر خوش قسمت بن گئے۔ اور ہم..... ہاں اور ہم۔ میں نے ارد گرد نظر ڈالی۔ شام کی چھ دس باہر سے رینگ رینگ کر اندر آ گئی تھی۔ ساتھ ہی اداسی بھی جو شام کی چھ دس کی ہمزاد ہے۔ ڈبے میں ابھی لائٹیں نہیں جلی تھیں۔ اپنی اپنی نشست پہ چپ چاپ بے حس و حرکت بیٹھے ہوئے سب آدمی سائے دکھائی پڑ رہے تھے۔

شور

"کیا خیال ہے۔ اس کے بعد کیا ہوگا؟"

"اس کے بعد کچھ بھی ہو سکتا ہے۔"

"مثلاً"

"مثلاً" وہ سوچ میں پڑ گیا "یار CONFUSION بہت ہے۔" پھر وہ چپ ہو گیا اور چائے پینے لگا۔

میں بھی چپ رہا اور چائے پیتا رہا۔ پھر باہر سے کسی کے چلانے کی آواز آئی میں نے کان کھڑے کئے۔ غور سے سنا اور اٹھ کھڑا ہوا "ضمیمہ آگیا" باہر جا کر ضمیمہ خریدا۔ واپس آ کر ضمیمہ کھولا اور ہم دونوں نے اکٹھے اسے پڑھنا شروع کر دیا۔

پڑھ چکنے کے بعد "اب کیا خیال ہے تمہارا؟"

"یار نئی ہی خبر ہے۔ کوئی نئی تفسیر تو ہے نہیں۔"

"پھر بھی کیا خیال ہے تمہارا۔ اب کیا ہوگا؟"

"اب کیا ہوگا؟ سوچ میں پڑ گئے" "یار ٹیڑھا سوال ہے"

"پھر بھی؟"

سوچتے ہوئے بولا "میرا خیال یہ ہے۔۔۔" مگر ارد گرد دیکھ کر پھر چپ ہو گیا "یار یہاں شور بہت ہے"

میں نے اس پاس کی میز پر نظر ڈالی۔ آس پاس کی سب میزیں بھری ہوئی تھیں۔ چائے پینے والے چائے کم پی رہے تھے۔ باتیں زیادہ کر رہے تھے۔ ہمارے میز کے بالکل برابر کی میز سب سے زیادہ پر شور تھی۔ پیالیاں کم نظر آتی زیادہ۔ اتنی بھنک اور نہیں پڑ رہی تھی کہ ان کے ہوتے ہوئے آس پاس کی کسی میز پر اطمینان سے بات نہیں ہو سکتی تھی۔

میں نے دل ہی دل میں تعجب کیا۔ تھوڑا غصہ بھی کیا۔ کیسے بے فکرے لوگ ہیں۔ ایسے بیٹھے باتیں کر رہے ہیں جیسے کچھ ہو ہی نہیں رہا ہے۔

"سوچو میز دو کا جائزہ لیا۔ کچن کے برابر کے گوشے میں کئی میزیں خالی نظر آئیں چلو ادھر چلتے ہیں"

ہم دونوں اٹھ کر کچن کے برابر والے گوشے میں جا بیٹھے۔ یہ گوشہ واقعی پر امن تھا۔ بات اطمینان سے ہو سکتی تھی۔ چائے کا بل ادا کر دیا۔ پھر اس کی طرف دیکھا "یہاں بات ہو سکتی ہے"

"ہاں یہاں بات اطمینان سے ہو سکتی ہے" اس نے اطمینان کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

"پھر کیا خیال ہے تمہارا۔ اب کیا ہوگا؟"

اسی گھڑی دو شخص داخل ہوئے اور ہمارے پاس کی میز پر آ کر بیٹھ گئے۔ ایک کی نظر ہماری میز پر رکھے خط پر پڑی "اچھا خط شائع ہو گیا ہے" اٹھ کر قریب آیا۔ "ذرا دیکھ سکتا ہوں؟"

"ضرور" یہ کہتے کہتے میں نے وہ کیسہ دو تین اخبار اٹھا کر اس کے حوالے کر دیے۔

[illegible]

ہوئے ایک شخص نے تبصرہ کو ٹالا ، اچھا ضمیمہ آگیا ، یہ کہتے ہوئے اٹھا اور قریب آکر اس بینچ کے
ورق پر ٹھیک گیا۔ اس نے یہ بات کسی قدر اونچی آواز میں کہی تھی۔ آس پاس کی کئی میزوں پر
جہاں یہ بات سنی گئی کان کھڑے ہو گئے۔ کئی ایک ٹھٹک کر اٹھے اور اس میز کے ارد گرد کھڑے ہو گئے۔

"کیا کہتا ہے ضمیمہ"

استفسارات، تبصرے، کوئی تیسری آواز، کوئی اختلافی نوٹ، کوئی تاسف بھرا کلمہ۔
بحث، الجھاؤ، دلچسپ ہوتا گیا۔ آوازیں اونچی ہوتی چلی گئیں۔

"وہ دونوں چپ اور دیکھتے رہے۔" پھر بے چینی سے بولا "یہ بہت شورت مچا رہا ہے
سنو بات کرنا بہت مشکل ہے۔"

"تو پھر نکلیں یہاں سے۔"

وہاں سے نکل کر ہٹے ہوئے اور پھر کیفے ڈی پیرس میں نشست پر مکان ہو گئی۔ تمہارے پاس قدم
رکھا تو لگا کہ شور کے سمندر میں اتر گئے ہیں۔ پھر مختلف چائے خانوں میں جا سکا۔ جگہ نہ ملی ہر جگہ شور
"یار بہت شور ہے"

"مجھے یہ نہیں آیا کہ آج اتنا شور کیوں ہے" میں نے کہا۔

"اور سنو، دیکھو، کتنا ہے کہ شہر سارا چائے پینے، دوستیں مارنے کے لیے نکلا ہوا ہے۔
لوگ کتنے بیکار ہیں۔"

"اتنا شور، اتنا شور، اس شہر میں تو ہمارے لئے سانس لینا مشکل ہو جائے گا" میں نے
اس کی تائید میں کہا۔

"یار یہ شہر کتنا خاموش ہوا کرتا تھا۔ ہم کتنے اطمینان سے اس سڑک پر چلا کرتے تھے۔"

میں نے سڑک پر دور تک نظر دوڑائی۔ بسیں، موٹریں، ٹیکسیاں، رکشے اور سب سے
بڑھ کر ایک ہجوم اس ہوا کے شور میں ایک خاموشی تھی۔ جب ہم ایک خاموش
بات کی تلاش میں نکلے، جانک بیٹھ سکے ہوا کہ شہر میں کتنا خوف ہو گیا ہے اور خوف کتنا خوف

گیا ہے۔

اب شاید اس کے یہاں بھی بات کرنے کی خواہش زور پکڑ گئی تھی خاموش گوشے کی تلاش میں جتنا میں سرگرم تھا اتنا ہی وہ سرگرم تھا۔ کہاں کہاں پہنچے اور کہاں کہاں سے مایوس پلٹ۔ اور بات کرنے کی خواہش تھی کہ بڑھتی جا رہی تھی۔ جیسے ہمیں بہت اہم مسائل پہ گفتگو کرنی ہے

"ریستوراں سب بکھرے ہوئے ہیں۔ آؤ چلو پیٹی باغ چلتے ہیں۔"

ہم اس پر شور شاہراہ سے گذر کر ایک خاموش رستے پہ پڑ لئے۔ چار قدم چل کر کمپنی باغ پہنچ گئے۔ کمپنی باغ کی فضا میں کتنا سکون کتنی آسودگی تھی۔ جہاں تہاں اکا دکا آدمی کوئی کسی روش پہ چہل قدمی کرتا ہوا، کوئی خاموش کسی بنچ پہ بیٹھا ہوا۔ ہم بھی ایک پتھر کی بنچ پہ بیٹھ گئے۔ شور کا سمندر پار کر کے آئے تھے۔ ست رہے تھے۔ قریب سے ایک جوڑا گذرا۔ تھوڑا آگے چل کر نوجوان نے لڑکی کا ہاتھ تھام لیا۔

دونوں درختوں کے سائے میں چلتے چلتے یک گھنے پیڑ کی اوٹ میں گئے اور نظروں سے اوجھل ہو گئے۔

"تفصیلات کا پتہ نہیں چل رہا۔ بہت کنفیوژن ہے" وہ بڑبڑایا۔

پانی رے پانی تیرا رنگ کیسا۔ دور سے آواز آئی۔

آواز قریب آتی گئی۔ یک نوجوان ٹرانسسٹر ہاتھ میں لٹکائے چلا آ رہا تھا۔ قریب ہی گھاس کے تختے پر بیٹھ۔ ٹرانسسٹر یک طرف رکھ جوتے کے تسمے کھولنے لگا۔ گانے نے ہم دونوں کو اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ کان لگا کر سنتے رہے سنتے رہے۔

"یہ لتا تھی؟"

"ہاں اور ساتھ میں کشور کمار۔" میں نے کہا۔

مگر اس کے بعد ٹرانسسٹر کی آواز اونچی ہوتی چلی گئی۔ لتا کا ایک گانا، دوسرا گانا، تیسرا گانا۔ پھر مٹر گشت کرتے چند نوجوان آئے۔ قریب ہی گھاس کے ایک تختے پہ انہوں نے بھی ڈیرا ڈال

دیا۔ ان کے پاس ٹیپ ریکارڈر تھا۔ انہوں نے اپنی پسند کے گانے سننے شروع کر دیئے تھے۔

"بابا یہ تو بہت بور ہیت ہے"

"اور ان کی پسند کتنی بیہودہ ہے۔ (VULGER) مجھے اس ٹولی پر سخت غصہ آ رہا تھا"

"ہمیں آج اس شہر میں کہیں پناہ نہیں ملے گی"

"پتہ نہیں لوگ گانا اتنی اونچی واز میں کیوں سنتے ہیں"

"دھیمے سر غیر موثر ہو چکے ہیں۔ شور اتنا ہے کہ کسی کو کسی کی بات سنائی نہیں دیتی ایسے میں آدمی کیا بات کرے"۔

ہم دونوں چپ ہو گئے۔ ایک طرف سے ٹرانسسٹر، دوسری طرف سے ٹیپ ریکارڈر۔ دائیں شور۔ بائیں شور۔ ہم بیزار ہو کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ مختلف رستوں پر چہل قدمی کی۔ شام ہو چکی تھی۔ باغ میں سیلانیوں کا ہجوم بڑھتا جا رہا تھا۔ ہم باغ سے باہر نکل آئے۔

"تم نے بی بی سی سنا تھا؟" چلتے چلتے اس نے پوچھا

"نہیں"

"بی بی سی سننا چاہیئے"۔ یہ کہتے کہتے وہ شروع ہو گیا۔ آخر دماغ میں تو وہی بات اٹکی ہوئی تھی۔ بلکہ کانٹا کھٹک رہا تھا۔ جب تک کانٹا نہ نکل جاتا ہم دونوں میں سے کسی کو چین نہیں آ سکتا تھا۔ کانٹا اب نکلنے لگا تھا۔ مگر اسی دم پھر پیچھے قدموں کی آہٹ ہوئی۔ وہ چپ ہو گیا۔ پیچھے چلنے والے تیز قدم چل رہے تھے۔ ہم نے اپنی رفتار سست کر دی جب ہی وہ آگے نکل گئے۔ اب اطمینان سے بات ہو سکتی تھی۔ مگر یہ سڑک ایسی تھی کہ شام پڑے لوگ چہل قدمی کرتے ادھر آتے تھے۔ اور جوں جوں ہمارے پیچھے آ رہے تھے وہ اتنے اطمینان سے چل رہے تھے کہ ہماری رفتار میں سستی آ جانے کے باوجود ہمارے اور ان کے درمیان فاصلہ پیدا نہیں ہو سکا۔

"چلو پیدل گھر چلتے ہیں" میں نے تجویز پیش کی۔

"تم تو اکیلے ہی رہتے ہو۔"

"اور کیا۔"

"پھر جیتے ہیں۔" "وہاں اطمینان سے بات کریں گے۔"

پیٹ لئے۔ گھر جا کر اپنا کمرہ کھول "بیٹھو۔"

بیٹھتے ہوئے اس نے ایک نظر ادھر ادھر ڈالی "یار تمہارے پاس ریڈیو نہیں ہے۔"

"ریڈیو نہ ٹرانسسٹر۔"

"ہوتا تو اس وقت بی بی سی سنتے۔"

"تمہارا خیال ہے کہ بی بی سی کچھ بتائے گا۔"

"بالکل بتائے گا۔ ویسے آج اپنا ریڈیو بھی سننا چاہیئے۔ مگر تم نے تو یہ کھڑاگ رکھا ہی نہیں ہے۔ نہ ریڈیو نہ ٹی وی۔"

"ایسے کھڑاگ بیویاں اکٹھا کیا کرتی ہیں۔" میں نے کہا

"اور بیوی بجائے خود ایک کھڑاگ ہے۔"

"اسی لئے تو پالا نہیں۔"

"اچھا کیا۔ سکون سے ہو۔ رک کر بولا "مجھے لگتا ہے کہ تمہارے بسائے بھی سب چڑیے ہیں۔"

"کیسے جانا۔"

"یار یہاں خاموشی بہت ہے۔"

"یہ محلہ نہیں ہے۔ فلیٹ ہیں۔ فلیٹ میں رہنے والوں کا پتہ نہیں چلتا ورنہ میرے دائیں بائیں فلیٹ ہیں ان میں پورے پورے خاندان آباد ہیں۔"

میں نے سوچا کہ چلئے چائے کا بندوبست کر لینا چاہیئے۔ چائے سامنے رکھی ہو تو بات اطمینان سے ہوتی ہے۔ ادھر ادھر کی باتیں۔ چائے کی پتی دو چینی تو رمق ہی ہے۔ کیتلی میں پانی بھرا ہیٹر پر رکھ دیا۔

"یار تمہارے پڑوس میں کوئی بچہ بھی نہیں ہے؟"

"ارے یار بہت ہیں۔"

"واہ! تو کوئی آتا نہیں ہے کسی قسم کی کوئی واردات ہی نہیں ہے۔"

میں نے کہا تاکہ یہ فیڈ ہیں۔ تم ٹھنڈے کے حساب سے مت دیکھو

میرے جواب نے اسے مطمئن نہیں کیا۔ تھوڑا چپ رہ کر بولا "یار بہت سناٹا ہے۔ لگتا ہے کہ جنگل میں آ گئے ہیں۔"

میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ میرا دھیان سنسناتے پانی کی طرف تھا۔

"یہ تم کیا کر رہے ہو؟"

"چائے بنا رہا ہوں۔ ابھی تیار ہوتی ہے۔ پھر اطمینان سے باتیں کریں گے۔"

"چھوڑو یار۔ وہیں اپنے ٹھکانے پہ چل کے چائے پیتے ہیں۔" وہ ایک دم سے ٹھنڈا ہو گیا۔

"یہاں سے تو مجھے وحشت ہونے لگی۔"

میں نے اسے حیرت سے دیکھا "یہاں اطمینان سے بات ہو سکتی تھی۔"

ٹھیک ہے مگر" اس نے کلائی پر بندھی گھڑی دیکھتے ہوئے کہا "یہاں بیٹھ گئے تو خبر وہ کا وقت نکل جائے گا۔ اپنے ٹھکانے پر چلتے ہیں۔ وہاں ریڈیو ہے۔ خبریں بھی سنی جا سکیں گی۔" رکا پھر بولا "یہاں تو لگتا ہے کہ دنیا سے کٹے بیٹھے ہیں۔"

واقعی۔ اس کمرے میں بند ہو کر تو دنیا سے میرا رشتہ بالکل ٹوٹ جاتا ہے۔ کچھ پتہ نہیں چلتا کہ باہر دنیا میں کیا ہو رہا ہے۔ اصل میں اس کمرے میں کوئی ایسا دریچہ نہیں جہاں سے آسمان نظر آتا ہو۔ آسمان نظر نہ آئے تو ایسا لگتا ہے کہ دن سے ہمارا رشتہ ٹوٹ گیا ہے۔

باتیں کرتے ہوئے سڑک خالی خالی تھی۔

اب کیا تھا اس نے تھوڑا چونک کر کلائی پر بندھی گھڑی دیکھی "کمال ہے آج اتنی جلدی سناٹا ہو گیا۔"

واقعی سناٹا تھا۔ کوئی کوئی رکشا گذرتی تو تھوڑا شور ہوتا مگر اس کے گذر جانے کے بعد خاموشی اور گہری ہو جاتی۔ ہمیں اپنے قدموں کی چاپ اونچی سنائی دے رہی تھی۔ ہم آہستہ چلنے لگے۔ اپنے ٹھکانے پر پہنچے۔ آج یہ ریستوراں تنی جلدی خالی ہو گیا۔ کبھی تھوڑی دیر پہلے ہم اسے بھرا چھوڑ کر گئے تھے۔ اس وقت شور سے کان پڑی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ تھوڑی دیر میں وہ بھی رخصت ہو گئے۔ اب صرف ہم رہ گئے۔ چائے کا آرڈر دیا۔

"آج ابھی سے یہاں الو بولنے لگا۔" وہ بولا

"اچھا ہی ہے۔ ہجوم میں بات نہیں ہو سکتی۔"

"ہاں اچھا ہی ہے۔" پھر سوچ کر بولا "یار کنفیوژن بہت ہے۔

"پہلے نہیں تھا؟"

"ٹھیک کہتے ہو کنفیوژن پہلے بھی تھا۔" پھر سوچ میں ڈوب گیا۔ آخر زبان کھولی "اس کے پیچھے کیا ہے، یہ تو ابھی پوری طرح واضح نہیں۔ مگر میرا خیال ہے۔" وہ چل پڑا تھا کہ اتنے میں چائے آ گئی۔ چپ ہو گیا اور چائے بنانی شروع کر دی۔ چائے بناتے بناتے بولا "یار وہ لڑکی اچھی تھی؟"

"لڑکی، کونسی لڑکی؟"

"وہی لڑکی جو کمپنی باغ میں نظر آئی تھی۔"

"اچھا وہ۔" وہ لڑکی اپنی سر کی بھری گھنی زلفیں اور شاداب چہرے کے ساتھ تصور میں پھر گئی "ہاں اچھی تھی۔"

جیسے سوکھی ہوئی ہوا میں اچانک ایک ٹھنڈا جھونکا آ جائے۔ مجھے تو ایسا ہی لگا۔ وہ بھی بنا نظر آ رہا تھا۔ پھر ہم نے اس خوشگوار جسم کی جملہ تفصیلات پر غور کیا اور طے کیا کہ لڑکی واقعی اچھی تھی۔

"یار" وہ سوچتے ہوئے بولا "لڑکی تو ہماری زندگی سے نکل ہی گئی۔"

میں ہنس پڑا "آئی کب تھی"۔

"پھر بھی" سنجیدگی سے بولا "آگے کم از کم اتنی ویرانی تو نہیں تھی"۔

میں پھر ہنس دیا۔ جواب کوئی نہیں دیا۔

سوچ کر بولا "وہ کہیں دکھائی دی؟"

میں چکرایا "کون؟"

"وہی"

اب میری سمجھ میں آیا کہ کسے پوچھ رہا ہے۔ طبیعت افسردہ ہو گئی "نہیں یار"۔

"اس کے بعد سے نظر ہی نہیں آئی"۔

"نہیں"

"تعجب ہے"۔

میں نے خود اس بات پر اس وقت کتنا تعجب کیا تھا۔ تعجب اور افسوس کر کے فارغ ہو گیا تھا۔ اب جو اس نے اظہار تعجب کیا تو مجھے پھر ایک مرتبہ تعجب ہوا کہ واقعی ایسی وہیں ہو گئی کہ پھر نظر ہی نہیں آئی۔

"یار تمہارے ساتھ بھی وہی ہوا جو میرے ساتھ ہوا تھا"۔

"اور جو ہر شریف آدمی کے ساتھ ہوتا ہے"۔ میں نے ٹکڑا لگایا۔

ہم دونوں ہی افسردہ ہو گئے۔ پھر نہ اس نے کوئی بات کی نہ میرا بات کرنے کو جی چاہا۔ چپ بیٹھے رہے اور چائے پیتے رہے۔ بی بی سی کی خبروں کا وقت آیا اور نکل گیا۔ ریڈیو پاکستان، پھر آل انڈیا ریڈیو۔ سب خبروں کے وقت نکل گئے۔

"چلیں یار"

"ہاں چلنا چاہیئے"۔

ہم جس کھڑے سے ہوئے۔ وہ اپنے گھر کی طرف۔ میں اپنے گھر کی طرف۔

○

بے سبب

بیوی نے اس کی طرف غور سے دیکھا "کس بات پہ ہنس رہے ہو؟"

"میں ہنس رہا ہوں؟ نہیں تو" وہ سٹپٹا گیا

"تو ہنس ہی نہیں رہے ہو۔ باچھیں تو کھلی جا رہی ہیں" وہ رکی۔ پھر بولی "کوئی یاد آ رہا ہے"۔

"یاد کون آتا" وہ سٹپٹا کر چپ ہو گیا۔

کئی مرتبہ اس نے کوشش کی کہ بیوی ادھر ادھر ہو جائے تو دل کھول کر ہنس جائے۔ مگر وہ ٹس سے مس ہی نہیں ہو رہی تھی ناشتے کے برتن باورچی خانے میں رکھے اور فوراً ہی واپس آ گئی رفتہ رفتہ اسے یقین آ گیا کہ گھر میں اسے ہنسنے کی آزادی میسر نہیں آ سکتی۔ پھر کہاں جایا جائے۔ گھر کی طرف سے مایوس ہو کر اس نے باہر تصور دوڑایا اور ایسے مقامات کو دھیان میں لایا جہاں اطمینان سے ہنسنے کے امکانات تھے۔ اصل میں آج صبح ہی سے اس کا ہنسنے کو جی چاہ رہا تھا۔ دفتر آج اسے دیر سے جانا تھا۔ خیال یہی تھا کہ گھر میں اطمینان سے بیٹھیں گے اور ہنسیں گے۔ لیکن گھر کے اندر ہنسنے کے امکانات اس نے مسدود دیکھے تو اٹھ کھڑا ہوا۔

"تمہیں تو دفتر آج دیر سے جانا تھا۔" بیوی نے ٹوکا

"ہاں مگر ایک دو کام باہر کے ہیں۔ سوچا کہ انہیں نپٹا لیا جائے۔ پھر ادھر سے ادھر ہی دفتر چلا جاؤں گا۔"

"جا رہے ہو تو بجلی کا بل بھی ادا کر دو۔ پرسوں آخری تاریخ ہے۔" یہ کہتے کہتے بیوی اٹھی۔ اندر گئی اور واپس آ کر بجلی کا بل اور رقم اس کے حوالے کر دی۔

جب وہ چلنے لگا تو بیوی کو پھر ایک کام یاد آ گیا۔ "ابھی میں نے کہا کہ خالہ اماں کو منی آرڈر بھی تو بھیجنا تھا۔ بل ادا کرو تو وہیں کہیں ڈاکخانہ میں منی آرڈر بھی کر دینا۔" اور جلدی سے سو کا نوٹ اندر سے لا کر اس کے ہاتھ میں پکڑا دیا۔

گھر سے نکل کر اس نے اپنے آپ کو آزاد محسوس کیا۔ اب میں اطمینان سے ہنس سکتا ہوں۔ سکوٹر سٹارٹ کرتے ہوئے ہنسی اس کے ہونٹوں پر کھیلنے لگی تھی کہ دفعتاً خیال آیا۔ کہ لوگ اسے سکوٹر پر ہنستے دیکھیں گے تو کیا کہیں گے۔ آدمی سکوٹر پر بیٹھا ہو اور ہنس رہا ہو تو کتنا عجیب لگتا ہے۔ بس اس خیال کے ساتھ ہی اس نے ہنسی کو ملتوی کر دیا۔

بجلی کے بل کی ادائیگی کے لیے بنک بھی نہیں تو کاؤنٹر کے سامنے ایک پوری قطار کو پایا۔ وہ بھی قطار میں لگ گیا۔ قطار رینگتی رہی۔ پورا گھنٹہ لگا۔ جیسے تیسے باری آئی۔

بل ادا کر کے ڈاکخانے پہنچا۔ منی آرڈر فارم لیا۔ اسے پُر کیا۔ فارم پُر کرتے کرتے کاؤنٹر پر اور بھی منی آرڈر بھیجنے والے آ گئے تھے۔ ایک کے بعد دوسرا۔ دوسرے کے بعد تیسرا۔ وہ سب سے پہلے تھا۔ سب سے بعد میں اس کی باری آئی۔

بنک اور ڈاکخانے نے اسے بہت لیٹ کر دیا تھا۔ سوچا کہ کسی ریستوران میں بیٹھ کر چائے پی جائے کہ طبیعت بحال ہو۔ بہت ہی ریستوران تھا۔ سر میں درد ہو گیا۔ ٹھنڈا پانی پی کر دوا کھا لی۔ گھونٹ بھر پانی پی کر کہیں جا کر طبیعت بحال ہو۔ طبیعت کی بحالی کے ساتھ ہنسنے کی خواہش عود کر آئی۔ مگر فوراً ہی خیال آیا کہ آس پاس کی بنچوں سے کسی نے اسے ہنستے دیکھا۔ تو کیا سوچے گا

یہی کہ اس آدمی کا دماغ چل گیا ہے۔ اس نے ارد گرد نظر ڈالی۔ میزیں بھری ہوئی تھیں۔ یہ لنچ کا وقت تھا۔ سب کھانے میں مصروف تھے کسی چہرے پر کوئی ہنسی نہیں تھی۔ مجھے ہنسنے کی فرصت ہے۔ اس نے سوچا۔ مگر میں اکیلا ہوں۔

آدمی اکیلا ہو اور ہنس رہا ہو تو خواہ مخواہ شک ہوتا ہے کہ سنک گیا ہے۔ تو ہنسنے کے لیے دوسرے کی شرکت ضروری ہے۔ یہ عجب طرح کی پابندی ہے اس نے چڑ کر سوچا۔

سوچا دفتر چلنا چاہیئے۔ ہنسنے کے لیے دفتر سے بہتر کوئی جگہ نہیں ہو سکتی۔ وہاں ہنسنے میں شرکت کرنے والے آسانی سے میسر آجاتے ہیں۔ دفتروں میں ان دنوں بھی کچھ ہوتا ہے فائلوں کے ڈھیر لگتے رہتے ہیں۔ دفتری وقت باتوں میں گزرتا ہے کبھی سیاسی مسائل پر بحث کبھی لطیفہ بازی۔ فاروقی کو کتنے لطیفے یاد ہیں۔ اسے بس بہانہ چاہیئے۔ شروع ہو جائیگا۔ مگر دفتر میں پہنچ کر اس نے اور ہی فضا دیکھی۔ مسئلہ یہ زیر بحث تھا کہ فاروقی کی سینیرٹی کو نظر انداز کر کے علی احمد کو جو فاروقی سے جونیئر تھا انیسواں گریڈ دیدیا گیا تھا۔ فاروقی کا موڈ سخت آف تھا۔

ایک بیزاری کے ساتھ وہ دفتر سے گھر کی طرف چلا۔ بس اسی بیزاری کے عالم میں اس کے ذہن میں ایک سوال اٹھ کھڑا ہوا کہ آخر وہ ہنسنا کیوں چاہتا ہے۔ ہاں آخر میں ہنسنا کیوں چاہتا ہوں۔ لیکن کیا ہنسنے کے لیے کسی سبب کا ہونا ضروری ہے۔ اسے یاد آیا کہ صبح جب اس کی بیوی نے اس سے پوچھا تھا کہ کیوں ہنس رہے ہو۔ اسے اس سوال سے کتنی کھیسیاہٹ ہوئی تھی۔ زندگی کے ہر مرحلہ میں ہر فعل پر یہ سوال کھڑا کرنا کہ کیوں کر رہے ہو کتنی فضول بات ہے آدمی کو کچھ کام ایسے بھی تو کرنے چاہئیں۔ جن کا کوئی مقصد نہ ہو۔ تو مجھے اپنے آپ سے یہ نہیں پوچھنا چاہیئے۔ کہ میں کیوں ہنسنا چاہتا ہوں۔ بس ہنسنا چاہتا ہوں محض اور صرف ہنسنا کسی وجہ کے بغیر، سبب اور مقصد کے بغیر۔

اس نے اپنے اس استدلال سے اپنے آپ کو قائل کر لیا تھا۔ مگر دل کے اندر ایک چور تھا دوسروں کو وہ کیسے قائل کرے گا۔ دوسرے ہنسنے اور رونے دونوں کی وجہ پوچھتے ہیں۔ تو دوسروں کو وہ کس طرح قائل کرے گا۔ دوسروں کو قائل کرنے کی تدبیر سوچتے سوچتے اس نے ارد گرد کا تصور

کیا۔ اور ہر طرف اسے وہ کچھ نظر آیا جس پر صرف ہنسا ہی جا سکتا ہے۔ ہنسنے کا اردگرد اتنا سامان ہوتے ہوئے کوئی کیوں پوچھے کہ کیوں ہنس رہے ہو اور کیوں۔ بتلانے کی ضرورت پیش آئے کہ ہم کتنا ہنس رہے ہیں۔ اسے تعجب ہوا کہ فی زمانہ ہنسنے کا اتنا وافر سامان ہوں ہے، پھر بھی ہم کتنا کم ہنستے ہیں جب ہمارے نہ ہنسنے سے صورت حال کی مضحکہ خیزی جاتی رہے گی۔

گھر پہنچ کر اس نے حالات کو بہت سازگار پایا۔ اب نقشہ صبح سے بالکل مختلف تھا۔ بیوی کی بادرچی خانہ میں مصروف تھی رات کے کھانے کی ہنڈیا خاصی دیر سے چڑھائی گئی تھی اسے اتنی فرصت ہی نہیں تھی کہ اس کے پاس آکر بیٹھتی۔ اس تنہائی کو اس نے بہت غنیمت جانا۔ تنہائی بھی کتنی غنیمت ہوتی ہے۔ ایسے میں کہ کوئی دیکھنے والا نہ ہو کہ آپ کیا کر رہے ہیں آدمی کتنا آزاد محسوس کرتا ہے۔

اس نے یوں ہی ریڈیو آن کر دیا۔ سوئچ گھمانے لگا کبھی ایک سٹیشن لگایا کبھی دوسرا سٹیشن کوئی خاص سٹیشن لگانا اور سننا مقصود نہیں تھا۔ وہ تو یوں تفریحاً سوئچ گھما رہا تھا۔ ایک سٹیشن سے ڈرامہ ہو رہا تھا۔ ڈرامہ کومیڈی کی قسم سے تھا کچھ دیر اس نے ڈرامہ سنا اور خوش ہوا۔ پھر اس نے سوئچ گھمایا دوسرا سٹیشن لگ گیا۔ یہاں بچوں کی کہانی ہو رہی تھی۔ سننے والے بچے چیخ چیخ کر کلکاریاں کر رہے تھے۔ پھر اس نے سوئچ گھما دیا۔ ایک اور سٹیشن لگ گیا۔ کچھ گانے بجانے کا پروگرام ہو رہا تھا۔ گانے بجانے والی ٹولی ترنگ میں تھی خوشی سے رہی تھی۔

جو سٹیشن بھی لگ جاتا یہی اسے احساس ہوتا کہ وہاں سے خوشی نشر ہو رہی ہے۔ دنیا میں لوگ کتنے خوش ہیں۔ اس نے دل میں کہا۔ ہاں دنیا میں لوگ کتنے خوش ہیں۔ وہ بڑبڑایا اور اداس ہو گیا۔ بغیر کسی سبب کے۔

کشتی

باہر مینہ برس رہا تھا۔ اندر حبس بہت تھا۔ حبس سے پریشان ہو کر کسی کسی نے سر باہر نکالا، پھر فوراً ہی اندر کر لیا۔

"بارش کچھ کم ہوئی؟"

"بالکل کم نہیں ہوئی۔ اسی شور کے ساتھ ہوئے چلی جا رہی ہے۔ یہ بارش ہے یا قیامت ہے؟"

"اندر کے حبس سے تو بہر حال بہتر صورت ہے۔"

"کوئی بہتر صورت نہیں۔ اندر حبس، باہر بارش۔ آدمی آخر کہاں جائے؟"

"سب کچھ تو ڈوب گیا۔ اب آخر بارش کیوں ہوئے چلی جا رہی ہے؟"

"ہم جو باقی رہ گئے ہیں۔"

"بس ہم ہی رہ گئے ہیں۔ مگر ہم ہیں کتنے انگلیوں پر گن لو۔ باقی تو چرند پرند ہی ہیں۔"

"ہاں باقی تو چرند پرند ہی ہیں۔ شاید اس لیے بھی حبس بہت ہو گیا ہے۔ جانوروں کے درمیان سانس لینا کتنا مشکل ہوتا ہے۔ پتہ نہیں کب تک ہم اس طرح جانوروں کے درمیان بسر کرتے رہیں گے۔"

"ہاں پتہ نہیں کب تک بارش تو رکنے کا نام ہی نہیں لے رہی کتنے دن گزر گئے کہ اسی ایک رفتار سے ہوئے چلی جا رہی ہے۔"

"شروع کس دن ہوئی تھی؟"

"کس دن ہاں کم از کم حساب تو کرنا چاہیے کہ کس دن شروع ہوئی تھی اور اب کتنے دن ہو گئے سب نے اپنے اپنے طور پر یاد کیا۔ پر کسی کو یہ نہ آیا کہ وہ کونسا دن تھا اور کونسی تاریخ تھی جب برسنا شروع ہوا تھا۔

"اس کا مطلب یہ ہے کہ ہمیں اب کچھ اندازہ نہیں کہ کتنے دن سے سفر میں ہیں۔"

کتنے دن سے ہم سفر میں ہیں، سب سوچ میں پڑ گئے۔ کتنے دن سے کتنے برس سے کتنی صدیوں سے بارش اور سفر میں یہی ہوتا ہے۔ لگاتار برسے تو لگتا ہے کہ برس برس سے برس رہا ہے اور برس برس برسے گا۔ سفر کے بیچ کوئی پڑاؤ نہ آئے تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ جنم جنم سے سفر میں ہیں۔

"بہر حال جس دن بارش شروع ہوئی ہے اسی دن ہم گھروں سے نکلے تھے۔ سو اگر ہم میں سے کسی کو یہ یاد ہو کہ ہم نے کس روز اپنے گھروں کو چھوڑا تھا تو . . . . . ."

"گھروں کو؟"

گھروں کو چھوڑنے کے بعد یہ پہلا موقعہ تھا کہ گھروں کا نام کسی کے لب پر آیا تھا تو ہمارے گھر بھی تھے یہ سوچ کے وہ حیران ہوئے اور چھوڑے ہوئے گھر دفعتاً انکے تصور میں یوں ابھرے جیسے کبھی کبھی وہ انہیں چھوڑ کر نکلے ہیں۔

"کاش وہ بھی میرے ساتھ سوار ہو جاتی۔ جانے اب کن پانیوں میں گھری ہوگی۔"

"وہ کون تھی؟"

"وہ جو زینے سے اترتے ہوئے بیٹھ جوں کی تیں مجھ سے کہہ رہی تھی۔" اور وہ سارا منظر اسکی آنکھوں میں گھوم گیا۔ وہ ہرنی جیسی آنکھوں والی کہ اپنے جادو کے زور سے پہلے پہل بے پہچانی تھی اور جب سیڑھیوں سے اترتے ہوئے اس نے اسے تھاما، تو لگا کہ دو گرم دھڑکتے پوٹے والی کبوتریاں اس کی مٹھیوں میں آ

گئی ہیں۔ دوسرے ہی لمحہ وہ اسکی گرفت سے آزاد تھی اور وحشی ہرنی کی مثال قلانچیں بھرتی بھاگی چلی جا رہی تھی۔ پر بعد اسکے وحشت اس ہرنی کی کم ہوتی چلی گئی حتیٰ کہ بھری دوپہر میں ٹیلے کے پیچھے کھجور تلے وہ اس کے گرم بوجھ سے ڈھیتی چلی گئی۔

زینے، ڈیوڑھیاں، آنگن، ٹیڑھی ٹیڑھی راہیں، ٹیلے، پھلوں سے لدے پرندوں سے بھرے اونچے پیڑ، ایک دم سے انہیں کتنا کچھ یاد آگیا تھا۔

"ان گھروں کو کیا یاد کرنا جو ڈھے گئے اور بہہ گئے"۔

ہاں یہ تو انہیں ابھی تک خیال آیا ہی نہیں تھا کہ جو پانی پہاڑوں کی چوٹیوں سے گزر رہا ہے اس نے انکے گھروں کو کہاں چھوڑا ہوگا۔

"مگر ہم ان گھروں کو کیسے بھول جائیں کہ ہم نے ان گھروں میں بیٹھ کر اترنے والی دلہنوں کے لیے گیت گائے اور گزرنے والوں کے لیے گریہ کیا"۔

تب سب آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔ پھر ان سب نے مل کر اپنے گھروں کو یاد کیا اور وہ روئے۔

"عزیزو! ان گھروں کی بربادی مقدر ہو چکی تھی"۔

"وہ کیسے؟"

تب گلگامش دوزانو ہو بیٹھا اور یوں گویا ہوا کہ ہمسفرو دیدۂ عبرت نگاہ رکھتے ہو تو مجھے دیکھو کہ میں کن کن پرشور سمندروں سے گزر کر اس اقلیم میں پہنچا جہاں اتناپشتم استراحت کرتا تھا۔ میں نے فریاد کی کہ اے اتناپشتم میں نے سنا تھا کہ حرکت میں برکت ہے اور سفر وسیلۂ ظفر ہے۔ پر مجھ درماندہ راہ نے حرکت کو بے برکت پایا اور سفر کو لاحاصل جانا جب کہ تو حیات جاودانی کے مزے لوٹتا ہے اور اس بہشت بنیاد اقلیم میں آرام کرتا ہے۔ یہ سخن سن اتناپشتم نے تامل کیا۔ پھر یوں لب کشا ہوا کہ اے تیرہ بخت میں دیکھتا ہوں کہ رنج سفر نے تجھے ہلکان کر دیا ہے اور الم نے تیرے اندر گھر کر لیا ہے سو تو گھڑی بھر کے لیے دم لے۔ پھر مودب ہو بیٹھا اور گلگامش ہوش سے سن کہ کیونکر میں نے حرکت میں برکت دیکھی اور سفر کو وسیلۂ ظفر جانا اور اس راہ حیات جاوداں پائی۔ میں نے اپنا گھر ڈھایا،

پھر کشتی بنائی۔ اس پر میں یہ ان جوابوں بولا کہ اے بزرگ یہ میں کیا سنتا ہوں کہیں کوئی اپنے ہاتھوں سے بھی اپنا گھر ڈھاتا ہے۔ اثناپشتم یہ سنکر افسردہ ہوا پھر بولا کہ میرے خداوند کی مرضی یہی تھی۔ وہ میرے خواب میں آیا اور خبر دی کہ اسمیں غضب میں ہے کہ زمین پر شور بہت ہو گیا ہے کہ یہ شور اسے سونے نہیں دیتا۔ سو اے اثناپشتم تیری عافیت اس میں ہے کہ اپنا گھر ڈھا دے اور کشتی تعمیر کر۔ تو اسے کہتا ہے گھر اپنا میں نے خداوند کی مرضی سے ڈھایا اور کشتی بنائی۔

تب انہوں نے سوچا اور یاد کیا کہ ہوا کیا تھا۔ ہوا یوں کہ زمین آدمیوں سے بھر گئی۔ آدمیوں سے نیز ظلم سے خداوند نے تو بس آدمی کو پیدا کیا تھا۔ پر اس نے آگے بیٹیاں پیدا کر ڈالیں اور خداوند کے بیٹوں نے ان بیٹیوں کو خوبصورت پایا اور اپنی جوروئیں بنا لیا۔ اور ان بیٹیوں نے جوروئیں بن کر مزید بیٹیاں جنیں کہ مزید خدا کے بیٹے ان پر ریجھے اور انہیں جوروئیں بنا کر اپنے گھروں میں لوٹے۔ بس اس طور زمین آدمیوں سے بھرتی چلی گئی۔ آدمیوں سے و نیز ظلم سے اور ایسا ہوا کہ خداوند پچھتایا اور دلگیر ہوا اور پھر یوں بولا کہ میں نے آدم زاد کو بھر پایا۔ سو میں اب انسان کو جسے میں نے خلق کیا تھا نابود کروں گا کہ زمین بہت بگڑ گئی ہے اور ظلم سے بھر گئی ہے۔

پھر انہیں بگڑے ہوؤں کے بیچ ایک نیک بندہ تھا کہ خداوند کے ساتھ چلتا تھا اور خداوند نے اس سے کہا کہ اے ملک کے بیٹے میں تجھے بچاؤں گا۔ سو تو ایسا کر کہ ایک کشتی بنا اور دیکھ جب طوفان اٹھے تو ہر ذی روح کے ایک جوڑے کو اپنے ساتھ سے در کشتی میں بٹھا جا اور اس بندے نے ویسا ہی کیا جیسا اس کے خداوند نے اس سے کہا تھا۔

پھر وہ بندہ بھی جورو والا تھا اور اس جورو نے بیٹے جنے جنہوں نے بڑے ہو کر خوبصورت بیٹیوں کو اپنی جوروئیں بنایا اور وہ جورو شوہر کو کشتی بناتے دیکھتی تو ٹھٹھا کرتی اور بیٹوں کو جمع کر کے کہتی کہ تمہارے باپ نے یہ کیا کھڑاگ پھیلا رکھا ہے کہ دن بھر اور رات بھر لکڑیاں کاٹ کاٹ کے کچھ بناتا رہتا ہے۔

یہ سنتے ہی ملک کے بیٹے نوح نے آخر زبان کھولی اور کہا کہ اے میری زندگی کی شریک

ڈر اس دن سے کہ نہ اگر تم تندرست ہو جاتے اور تو کر مجھے طوفان کی خبر سنائے دور بھور بیٹھے
منوجی یہ دیکھ بھوچک رہ گئے کہ مچھلی بڑی ہو گئی ہے اور باسن چھوٹا رہ گیا ہے۔ کل ہی تو اشنان کرتے
سمے ان کے چلو میں یہ مچھلی آ گئی تھی کہ اس سمے چھنگلیا انگلی کے سمان تھی۔ وہ اسے پھینکنے لگے
تھے کہ اس نے دہائی دی کہ پرہیو شانتی میں تمہارے شرن لینے آئی ہوں کہ میں چھوٹی مچھلی ہوں اور
ندی اندر بڑی مچھلیوں کے بیچ نہیں رہ سکتی کہ بڑی مچھلی چھوٹی مچھلی کو کھا جاتی ہے انہوں نے
اسے اپنے شرن میں لے لیا اور ایک کونڈے میں جل بھر کے اسے اس میں ڈال دیا۔ پھر اب وہ دیکھتے
تھے کہ کونڈا چھوٹا رہ گیا ہے اور مچھلی بڑی ہو گئی ہے۔

منوجی نے مچھلی کو کونڈے سے نکال کے گھڑے میں ڈال دیا۔ اور پانی اس میں بھر دیا۔ پر اگلے دن
پھر بھوچکے جب منوجی پوجا کے لیے اٹھے تو دیکھا کہ گھڑا چھوٹا رہ گیا ہے اور مچھلی بڑی ہو گئی ہے کہ دم اس
کی گھڑے سے باہر نکل ہوئی ہے اب انہیں اور بھی اچرج ہوا کہ تنک سی مچھلی بڑھتے بڑھتے اتنی بڑھ گئی
کہ گھڑے میں نہیں سماتی۔ مچھلی نے دہائی دی کہ پرہیو کرپا کرو۔ گھڑے میں میرا دم گھٹ رہا ہے۔

منوجی کی کٹیا کے باہر ایک جل کنڈ تھا۔ انہوں نے مچھلی کو گھڑے سے نکال کے جل کنڈ میں ڈال دیا
اور نچنت ہو گئے۔ پھر اگلے دن انہیں چنتا لگ گئی۔ جل کنڈ چھوٹا رہ گیا تھا۔ مچھلی بڑی ہو گئی تھی۔
پورا جل کنڈ سے باہر نکل ہوئی تھی۔ مچھلی نے پھر دہائی دی کہ پرہیو تم نے مجھے اپنے شرن میں لیا
ہے پر مجھے تمہارے شرن میں چین نہیں ملا۔ منوجی نے پرہیو کے مچھلی کو جل کنڈ سے نکالا اور تالاب سے
لے جا کر کھسکا دیا۔ کہا کہ لے اب تو نہیں تیرا اور چین کر۔

منوجی مچھلی کو تالاب میں چھوڑ کے گھر ایسے آئے جیسے سر سے بڑا بوجھ اتار کے آئے ہیں۔ اس رات وہ چین
سے سوئے۔ پر جب صبح کو ان کی آنکھ کھلی تو آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ مچھلی کی پورا تالاب سے نکل بھی
ہوئے ہوئے ان کے آنگن میں آ پہنچی تھی۔ وہ جھٹ پٹ کھڑے ہو گئے۔ کیا دیکھتے ہیں کہ تب چھوٹی رہ گئی
تھی مچھلی بڑی ہو گئی ہے۔ [illegible] اس کا منہ تھا۔ باقی دھڑ اور پورا سب باہر۔
مچھلی بولی کہ پرہیو تمہارے شرن میں میں مرتے اور سانس لینے کو ترستی ہوں۔

منوجی نے مچھلی کو ندیا سے نکال کر پالا اور پھر گنگا ندی کی اور وہاں جا کے انہوں نے اسے ندی میں چھوڑا اور کہا کہ ہے ری مچھلیا میں نے تجھے گنگا میا کی گود میں دیا۔ میا کی گود میں چاہے کمت پھیل۔ پھر وہ مچھلی یہ کہتے تھے کہ مچھلی پھیلنے لگی۔ اتنی پھیلی کہ گنگا میا کی گود چھوٹی رہ گئی۔ مچھلی بڑی ہو گئی۔

منوجی یہ دیکھ کر بھونچکا رہ گئے۔ بولے۔ ری تو نرالی مچھلی ہے کہ پھیلتی ہی جا رہی ہے جینے کا ڈھنگ یہ ہے کہ جتنی چادر ہو اتنے پاؤں پھیلائے۔ پھر تیرے لچھن یہ ہیں کہ جھیل دکھتی ہے اس سے زیادہ پھیلتی جاتی ہے۔ چلو اب تیرا اپائے یہی ہے کہ میں تجھے ساگر کے حوالے کر دوں۔ یہ کہہ کے منوجی نے مچھلی کو گنگا کی گود سے لیا اور کندھے پر لاد چلے ساگر کی اور۔

ساگر کی اور جاتے ہوئے منوجی کو دھیان کی لہر بہا کے جیتے تھے میں لے گئی جب وشنو جی یونہ کے روپ میں پرگٹ ہوئے تھے۔ انہوں نے اس ڈشٹ راجہ سے تین ڈگ دھرتی مانگی تھی۔ اس مورکھ نے سوچا کہ یہ ڈشٹ تین ڈگوں میں کتنی دھرتی جیتی ہے مانگ مان لو۔ یہ سوچ اس نے مانگ مان لی۔ پر وشنو جی ایک دم سے بونے سے دیو بن گئے۔ انہوں نے تین ڈگ لیے بھر کے کہ دھرتی اور آکاش دونوں تین ڈگوں میں سمیٹ لیے۔ اس دھیان نے منوجی چونکا دیا۔ ایک سندیہ کے ساتھ انہوں نے مچھلی کو دیکھا۔ پھر نئی دھیان کی لہر آئی۔ جی میں کہا کہ اس سمے تو دھرتی راکشسوں کے چنگل میں تھی سو وشنو مہاراج نے انہیں اس پرکار جل دیا اور دھرتی کو ان کے چنگل سے نکالا۔ آج کے ڈشٹ ایسے کون سے بڑے راکشس ہیں کہ وشنو مہاراج ایسا سوانگ بھر لیں گے۔ انہیں دیکھیں تو بھی چپ چاپ ٹھیلوں کے سمان مسل ڈالیں۔

بس یہی سوچتے سوچتے منوجی ساگر کنارے پہنچ گئے۔ مچھلی کو ساگر میں دھکیلا اور کہا کہ اب تو میرا بڑھاپا ہے وشال ساگر میں جتنا چاہے اتنا پھیل جا۔ وہ یہ کہتے تھے کہ مچھلی پھیلنے لگی پھیلتے پھیلتے پورے ساگر پر چھا گئی۔

منوجی نے ایک پیڑ کے ساتھ بچھونا کیا۔ پھر شردھا سے ان کا سر جھک گیا۔ دونوں ہاتھ جوڑ کے آنکھیں موند کے کھڑے ہو گئے اور کہنے لگے۔ ہے پرمیشور تیری۔ اور تیری کرپا ہے دھرتی اور آکاش

کے ہاتھوں اشانت ہے پر تجھے شانتی ملے گی۔ سو تو ناؤ بنا جب ساگر امنڈے اور دھرتی ڈولے تو پنچھیوں پکشوؤں میں سے ایک ایک جوڑا سنگ لے اور ناؤ میں بیٹھ جا۔

منوجی یہ سن بولے کہ ہے پربھو جب ساگر امنڈے گا تو میرے ہاتھوں کی بنائی ہوئی لوہی نیا ڈولے گی یا نہ ڈولے گی۔ آواز آئی کہ ہے منو تو اپنے میری مونجھ کے بل سے باندھ دیجیو۔ بولے کہ باندھوں گا۔ کہا ہے سے۔ میرے پاس کوئی رسی نہیں ہے۔ ترنت ایک سانپ رسی سمان لہروں میں لہرایا ہے منو یہ رہی رسی اس سے نیا باندھ لیجیو۔

تب زوجہ حضرت نوح کی حضرت کے پاس پہنچی۔ اس حال سے کہ اس کے ہاتھ آٹے میں سنے ہوئے تھے اور ہوش اڑے ہوئے تھے۔ یعنی تشویش بولی کہ اے مرے والی۔ ہمارا گرم تندور ٹھنڈا ہو گیا ہے اور پانی اس کی تہہ میں سے ابل رہا ہے۔ حضرت نے تامل کیا۔ پھر یوں بولے کہ دیکھو رب ذوالجلال کا دن آن پہنچا ہے۔ تو یوں کر کہ اپنے جنوں کو اکٹھا کر اور کشتی میں سوار ہو جا۔ اس پر وہ جورو یہ بولی کہ میں تندور پر طشت ڈھکے دیتی ہوں۔ پھر پانی نہیں ابلے گا۔ یہ کہہ کے وہ روڑی ہوئی اندر گئی۔ طشت الٹا کر کے تندور پر ڈھکا اور اوپر اس کے بڑا سا پتھر رکھ دیا۔ یہ کر کے وہ باہر آئی اور اپنے والی سے بولی کہ دیکھو میری ترکیب کام آئی۔ پانی اپنا نہ ہو گیا ہے۔ وہ یہ کہتی تھی کہ پانی انگنائی سے نکل کے باہر امنڈنے لگا۔ طشت اور پتھر اس کے بیچ تیرنے لگے تھے، اور اسی ساعت بزبر کے گھر والے کی زوجہ حواس باختہ آئی اور چلائی کہ میرے گھر کے تندور سے فوارہ چھوٹ رہا ہے۔ انگنائی میری جل تھل ہو گئی۔ پھر مختلف گھروں سے بیبیاں نکلیں اس حال سے کہ ہوش ان کے اڑے ہوئے تھے۔ ہر ایک کے لب پہ خبر یہ تھی کہ تندور ان کے گھر کا گرم سے ٹھنڈا ہوا، اور پانی اس سے ابلنے لگا اور سیب باہر سے امنڈ سے تو اسے روکا جا سکتا ہے مگر جب گھر کے اندر سے پھوٹ پڑے تو کیونکر اس پہ بند باندھا جائے۔

سو یوں ہوا کہ دم کے دم میں اس بستی کے سب تندور ٹھنڈے ہو گئے، اور وہ ایسا وقت تھا جب ابھی ایک گھر والیوں نے اپنے اپنے تندور گرم کیے تھے۔ تندوروں میں انگارے دہک رہے تھے اور روٹیاں پک کر گرم گرم نکل رہی تھیں کہ دفعتاً ایک تندور ٹھنڈا ہوا۔ پھر دوسرا تندور ٹھنڈا ہوا۔ پھر کئی میں سے

تنور میں آگ بھڑکی اور نمی پیدا ہوئی پھر ہلکا ہلکا پانی رسنے لگا۔ پھر جیسے تنور پھٹ گئی ہو۔ ایک دم سے پانی اُبلنے لگا۔ پانی تنور میں سے اُبلا، انگنائیوں میں امنڈا اور شاہراہوں میں پھیلا اور پھر بارش شروع ہو گئی ایسے جیسے آسمانوں کے سب دریچے کھل گئے ہوں۔ تب حضرت نوحؑ نے کہا کہ بیشک خداوند کے قہر کا دن آن پہنچا ہے۔ اور تب حضرت نوحؑ نے کشتی نکالی۔ سب جانوروں کے جوڑوں کو اس میں بٹھایا اور زوجہ سے کہا کہ اے مری زوجہ رحیمہ قہر کی ساعت آن پہنچی۔ تنور پر ڈھکا ہوا تیرا المشت پتے کی مثال پانی میں بہہ گیا اور تنگمن تیرا پانی سے بھر گیا اب یوں کر کہ اپنے جنوں کو اکٹھا کر اور کشتی میں سوار ہو جا۔

نسبرده زوجہ یہ بولی کہ اے مرے والی اس گھر میں میں نے تیرے سنگ پانچ سو سے اوپر برس کھینچے۔ دن گزارے۔ راتیں بسر کیں۔ یاد کر کہ ہم دونوں نے مل کر اس گھر میں کتنے دکھ دیکھے اور کتنے سکھ پائے کتنی بار میں بار آور ہوئی، دودھوں نہائی، پوتوں پڑپوتوں کی بہاریں دیکھیں۔ عرض کہ میں کیونکر اس گھر کو چھوڑ دوں۔"

تب نوحؑ نے فرمایا کہ اے مری رفیقہ خانہ ہستی بے بنیاد ہے اور گھر کہ آدم کے بیٹوں نے بنائے ہوتے ہیں، وہ سراسر خرابی میری کہ میں نے گھر بنایا ہے ان لوگوں کے جن کے ظلم سے زمین بھر گئی اور ٹیڑھی ہو گئی ہو۔ جینا اس گھر کا مقدر ٹھہرا۔ سو اس سے پہلے کہ دیواریں اس کی بیٹھ جائیں اور چھت اس کی تن پڑے تو یہاں سے نکل اور کشتی میں بیٹھ کہ آج زمین و آسمان کے بیچ وہی ایک پناہ گاہ ہے۔"

یہ سن کر زوجہ حضرت کی ڈھیٹ ہو کے یہ بولی کہ اگر میرا گھر مجھے پناہ نہیں دے سکتا تو پھر مجھے کہاں پناہ ملے گی

تب حضرت اپنے بیٹوں سے مخاطب ہوئے اور کہا کہ اے مرے بیٹو، تمہاری ماں نے تو یہیں مرنا ہے اور جب کہ ہوتے دنوں میں شامل ہو گئی ہے تو باپ کی ہمراہ کشتی میں بیٹھ جاؤ۔ میاں اتنی باتوں میں نہ پڑو۔ ہدایت کے گیت سے بچ جاؤ۔

یہ سن کر سب بیٹے کشتی میں سوار ہو گئے سوائے بڑے بیٹے کنعان کے کہ اس نے باپ کی نافرمانی کی۔

باپ سے کہا کہ اے میرے باپ میں کیونکہ اس گھر کو جس میں میری نال گڑی ہے چھوڑ کر اور کیونکہ اس مٹی سے جس نے مجھے دس اور جس دیا ہے منہ موڑ کر اس کشتی میں سوار ہو جاؤں جس میں تو نے ہر رنگ کا جانور جمع کر لیا ہے۔

حضرت نے بیٹے کی بات سن کے کہا کہ اے میرے بیٹے دیکھ یہ قہر کا دن ہے سو انسان اور حیوان سب ایک کشتی میں سوار ہیں کہ طوفان بے امان ہے اور زندگی کی ضمانت اس کشتی کے سوا کہیں نہیں ہے۔

بیٹا بولا کہ اے میرے باپ تنہائی کی موت ہجوم کے ساتھ زندہ رہنے سے بہتر ہے اور گھر کے اندر پانی میں غرق ہو جانا اچھا ہے بہ نسبت اس کے کہ آدمی اجنبی پانیوں میں جانوروں کے درمیان بسر کرے

تب حضرت نوحؑ اپنی بی بی سے اور اپنے بیٹے سے مایوس ہو گئے کہ انہوں نے زمین پکڑی اور نافرمانوں میں شامل ہو گئے اور تب کشتی روان ہوئی اور حضرت نے کہ سلام ہو ان پر ہمارا سمندر کے بیچ میں گڑی جانب دیکھا جیسے وہ چھ مہینے تک سب کو بیس کر چھوڑ رہے تھے اور انہوں نے دیکھا کہ ان کے باپ کا بنایا ہوا بیڑہ سے بچا تک وارادہ گھر کر کل تک شدید تھا اب امنڈتی موجوں کے بیچ خالی ڈھنڈار پڑا تھا اور ان کی زوجہ اور ان کے بیٹے نے برستے آسمان تلے چھت پر پناہ لی ہوئی تھی پھر یوں ہوا کہ وہ گھر آنکھوں سے اوجھل ہوتا چلا گیا اور پانی کا زور بڑھتا چلا گیا۔

مینہ ایسے برسا جیسے آسمان کے سب دروازے اور دریچے چوپٹ کھل گئے ہوں۔ مینہ دن رات برسا دن دن رات۔ لگاتار برسا کہ دن اور رات کا صبح و شام کا دن اور دن کا فرق مٹ چلا۔ زمین نظروں سے یوں اوجھل ہوئی جیسے کبھی تھی ہی نہیں۔

پھر جب ہوا کہ وہ کشتی کے اندر بیٹھے بیٹھے بیکل ہوئی۔ اس نے پر پھڑپھڑائے اور کائیں کائیں کرتا ہوا گیا مگر جلد کاٹنے کے بعد پھر واپس آ گیا۔ اور اس کی واپسی اعلان تھی کہ اب کہیں خشکی نہیں ہے کہ پنچھی کا نشانہ بن سکیں۔

[illegible] کو بیکل ہوئی انہوں نے پوری کشتی کا چکر کاٹا کہ کہیں کوئی بل ہے اور وہ اس [illegible] پر [illegible] کوئی بل نہ پایا۔ مگر بل تو ہونا چاہیے کہ وہ اس میں سما سکیں۔

سوچا انہوں نے کشتی کے پیندے سے کوئی ناخدا درخ کر دیا۔ کشتی کے جانور یہ دیکھنا اور اداس ہوتے یہ سوچ کر کہ مبادا کشتی میں چھید ہو جائے اور اس میں پانی بھر جائے اور وہ غرق ہو جائے۔ تب انہوں نے فریاد کی حضرت نوحؑ سے اور افسوس کیا حضرت نوحؑ نے کہ دائے خرابی میری کہ میں نے کشتی میں سوار کیا جو موت کو جن کا نتیجہ وہی یہ ہے کہ گنہ گار اور سوراخ کر دو۔ حضرت نے انہیں اس فعل سے باز رہنے کی ہدایت کی۔ مگر وہ باز نہ آئے۔ تب حضرت نے تنگ آ کر شیر کے منہ پر ہاتھ پھیرا کہ ہاتھ پھیرتے ہی اس کے تھنوں سے ایک بلی کا چھینٹا چوہوں پر اور چت کر گئی جنہیں دم کے دم میں۔

تب کشتی کے سب جانوروں نے شادمانی کی اور بلی پر آفرین بھیجی کہ اس نے انہیں آنے والی بلا سے بچایا۔ پھر یوں ہوا کہ اسی ساعت کبوتری نے پر پھڑپھڑائے اور کشتی سے باہر نکل اڑ گئی۔ وہ دیکھا انہوں نے کہ پیند نظر آیا ہے اور کبوتری زیتون کی پتی چونچ میں دبائے واپس آ رہی ہے اور وہ شادمان ہوتے ہوئے سوچ رہے کہ پانی اترنے لگا ہے اور خشکی نمود کرنے لگی ہے۔ مگر پھر انہوں نے یہ دیکھا کہ چونچ میں زیتون کی پتی سمیت کشتی میں آئی تو بلی پر جھپٹی اور اسے چت کر گئی۔ یہ کیا ہوا انہوں نے دیکھا اور دم بخود رہ گئے ساتھ میں زیتون کی پتی بھی عجیب بات ہے۔

"اب ہم پانی پر ہیں۔ اور کوئی یہ بتانے والا نہیں ہے کہ خشکی کہاں ہے"۔

پھر یہ سلسلہ ختم ہو گیا۔ بادل کی گرج کتنی دیر سے سنائی نہیں دی تھی۔ مگر پانی کی دھار سی شور سے گرج رہی تھی اور اونچے پہاڑوں کی چوٹیوں سے گزر رہی تھی۔ کسی کسی نے سر نکال کر باہر دیکھا پھر فوراً ہی اندر کر لیا۔ "بہت پانی ہے"۔

اندر حبس بہت تھا اور بلی بیٹھی تھی۔ باہر پانی گرج رہا تھا اور زمین و آسمان ملے نظر آ رہے تھے۔ زمین و آسمان اور زمین و زمان۔ لگتا تھا کہ ایک زمانہ ہو گیا، انہیں گھروں سے نکلے ہوئے اور ایک زمانہ ہو گیا انہیں پر شور پانیوں کے بیچ ڈولتے ہوئے۔

"کیا ہم کبھی واپس نہیں جا سکیں گے؟"

"کہاں؟"

"اپنے گھروں کو"

اپنے گھروں کو؟ ایک بار پھر انہیں حیرانی نے آلیا۔ گھر۔ یک بار پھر گھروں کی یاد نے انہیں یوں آلیا جیسے کوئی بڑا جھکڑ پیڑوں کو آ لے اور انہیں ہلا دے۔

"عزیزو! کون سے گھر۔ باہر جھانک کے دیکھو۔ کوئی بستی کوئی دیوار و در کہیں دکھائی پڑتے ہیں۔ کیا تم نے گلگامش سے نہیں سنا کہ اتناپشتم نے گھر ڈھا کر کشتی بنائی تھی؟"

"اتناپشتم نے اچھا نہیں کیا۔"

"ہاں مگر اتناپشتم کے خداوند کی تو تسلی ہو گئی کہ اب زمین پر پانی کے شور کے سوا کوئی شور نہیں ہے کہ اس کی نیند میں خلل ڈالے۔"

مارکنڈے نے باہر جھانک کے دیکھا چاروں اور گھور اندھیر۔ اندھیرا اور سناٹا اور جل کی گرجتی دھارا پرم آتما نیند میں تھی اور شیش ناگ کے پھن پھیلے ہوئے تھے۔ اس نے سر اندر کر لیا۔ نارائن۔ نارائن۔ گہرا ڈ کے اوپر اندھیرا تھا۔ ورخداوند کی روح پانیوں پر جنبش کرتی تھی۔ پانی جس کا کوئی اور چھور نہیں تھا پانی کی گرجتی دھار میں ازل اور ابد کے ڈانڈے مل جاتے ہیں اور زمین اور زماں گھل مل جاتے ہیں۔ انہیں کچھ دکھائی نہیں تھا کہ کب سے گھروں سے نکلے ہوئے ہیں اور کب سے پُرشور پانیوں میں بہہ رہے ہیں تنکوں کی طرح اور گو اپھر پیکل ہو۔ پر پھر پیدا ہے کہ ڈگیا دور تک کے نہیں آیا۔ انہوں نے باہر جھانک کے دیکھا، مینہ بے شک تھم گیا تھا۔ مگر پانی اسی طرح امنڈا ہوا تھا۔ اور گرج رہا تھا۔ کوئے کا دور دور پتہ نہیں تھا۔

"کوا سیانا جانور ہے۔ وہ موت کے نہیں آئے گا۔"

"خیر یہ تو پتہ چل ہی گیا کہ کہیں نہ کہیں خشکی ہے سو ہماری کشتی کسی نہ کسی کنارے جا ہی لگے گی سو تے ہمارے رب ہیں ریت کی جگہ تارے اور تحقیق تو سب سے بہتر تارنے والے ہیں۔"

"مگر ریت کی جگہ کہاں ہے ہم گہرے پانیوں کے بیچ ہیں اور کوئی بتانے والا نہیں کہ

[illegible] کہاں ہے اور پرست کی جگہ کونسی ہے یاں اگر نوح ہمارے بیچ میں ہوتا تو . . . . . .

"نوح؟ . . . . . نوح یہاں نہیں ہے۔"

"نہیں؟"

سب نے خوف بھری نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھا۔ آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک دوسرے سے پوچھ رہے تھے، نوح کہاں ہے؟ تب ماتھ طائی نے زبان کھولی اور یہ کلام سب پر لایا کہ۔ اے [illegible] [illegible] ہاتھ سے مت چھوڑو۔ دیکھتے ہو کہ یہ وہ غیب سے کیا نمود ہوتا ہے۔ مجھے ڈر ہے کہ یہ سب بھری ندیوں سے بچ بچا ایسی کشتیوں میں سفر کرتے ہیں [illegible] کوئی کھوٹ نہیں [illegible] کان دھر کر [illegible] کو [illegible] [illegible] چلا جاتا تھا۔ کہ ایک پہاڑ [illegible] نظر آیا۔ [illegible] کی طرف [illegible] تین دن کے بعد [illegible] پہنچے۔ اور [illegible] کو دیکھا [illegible] پایا۔ فکر [illegible] کوئی [illegible] نہیں ہے جس سے اس کا [illegible] پوچھوں۔ [illegible] دیکھتے ہیں کہ ایک [illegible] شور سے [illegible] اور [illegible] [illegible] [illegible]

نے تاڑ کو باندھا۔"

سب نے باہر جھانک کے دیکھا۔ باہر چاروں دور گھور اندھیرا اور گرجتے جل کی دھارا۔ مانو بھوساگر امنڈ رہا ہو۔ پر مچھلی کا کہیں اتا پتا نہیں تھا۔

"مچھلی تو کہیں دکھائی نہیں دے رہی۔"

"ستو دا سے ڈھونڈو۔ دادا کے بال سے تو ہم بندھے ہوئے ہیں۔"

سب نے باہر دور تک دیکھا۔ بس لہراتی رسی دکھائی پڑی۔ مچھلی کہیں نہیں تھی۔ "ستو درسنی تو ہے کہ سب سمان تاڑ کے چاروں اور لہرا رہی ہے۔ پر مچھلی نہیں ہے۔"

"یہ تو بہت چنتا کی بات ہے۔"

سوچنتا نے انہیں گھبرا دیا۔ یہ سنتے ہی آل پکڑا دور دور کی بات دھیان میں آئی۔ پر گتھی نہ کھلی۔ تاڑ ڈول رہی تھی۔ اور چاروں اور جل کی دھارا گرج رہی تھی۔

○

نئے افسانہ نگار کے نام

[illegible]

مباش منکر غالب کہ در زمانہ قدست

[illegible]

[illegible] کہا تھا۔ اس بیان سے [illegible] کی اردو [illegible]

کہ نہیں رہی ہے۔ ہندی لکھنے میں یا ہندی میں لکھنے میں اب مجھے کوئی قباحت نظر نہیں آتی مگر افسوس کہ میری اس زبان سے آشنائی نہیں ویسے سنسکرت نہ جاننے کا زیادہ افسوس ہے۔ جتنی اور جیسی کچھ جانتا ہوں اردو ہی جانتا ہوں۔ بات یہ ہے کہ اپنے وطن کو اپنے وطن لکھتا ہوں ہیزم نہیں لکھتا۔ بھیڑ کو بھیڑ اور ٹیٹے کو ٹیٹا کہتا ہوں۔ زنبور نہیں کہتا۔ شکر ہے کہ میں نے اردو سنسکرت جوش ملیح آبادی اور ن۔ م۔ راشد سے نہیں پڑھی ہے اور اردو کی تاریخ کو رام بابو سکسینہ کی تاریخ ادب اردو سے نہیں سمجھا ہے۔ اردو میں نے اپنی بستی کی خلقت سے سیکھی ہے اور میرے میر باقی کبیر اور نظیر سے پڑھی ہے اور بیتال پچیسی ڈاکٹر گیان چند کے اس انتباہ کے باوجود پڑھی ہے کہ اس کی زبان اردو نہیں ہے۔ میری بستی کی خلقت کوثر میں دہلی زبان نہیں بولتی تھی وہ لکھنؤ والے بولتے ہوں گے میں نے کبھی کوثر میں دہلی زبان بولنے اور لکھنے کی کوشش نہیں کی۔ میں زبان کو بہت دھونے اور پاک کرنے کا قائل نہیں۔ لکھنؤ کے پاکبازوں نے اس چکر میں اردو کے کتنے تذکرہ لہجوں اور لفظوں پر جھاڑو پھیر ڈالی اور زبان کی تاریخ مرتب کرنے والوں نے کتنے کتنے شعر کو اردو سے ہندی کی طرف دھکیل دیا۔ باقر مہدی کی ایسی ہی تاریخیں پر پٹے ہیں اور جوش کی منظومات کو بگاڑ کر پڑھے ہوئے ہیں۔ نہیں کہ پورے کی زبان سنسکرت آمیز ہندی ہی نظر آئے گی۔

اصل میں مجھے باقر مہدی کے اپنے بارے میں تحفہ بیانات پڑھ کر یہ احساس پیدا ہو گیا ہے کہ وہ اپنے کو کوئی نعمت کے کیچڑ میں مجھے ہی ایک کھونٹے سے باندھ دینا چاہتے ہیں۔ مجھے خوب احساس ہے کہ جب سے نامور ادیب میں تحریروں کی بابیسی ہے ادیب کسی ایک کھونٹے سے نہ بندھ زیادہ بات کرتے ہیں۔ ان میں فرنچین کو ہدایت ستی ہے۔ بندھے ہوؤں کو پیغمبر تک دوسرے نصیبوں سے تاجدار ہے دوسرے ہاتھ سے آسانی سے ۵۰۰ دو دھ لیتے ہیں مگر میں کسی تحریک کا ڈنکا نہیں کوئی نظریاتی جھنڈا نہیں۔ نظریوں سے کچھ دلچسپی ہو سکتی ہے۔ کسی مرغوب نظریے کی تبلیغ کی خواہش بھی ہو تو اس خواہش نے مجھے کبھی اتنا حیوان نہیں بنایا کہ اس کے کوپر دیگنڈے کی سطح پر لے آئے۔ پتہ نہیں جو فن میں افسانے میں نظریے کے کاندھے پر بندوق رکھ کر نہیں چلاتا میرے لیے

تجربے کی غلیل بہت ہے۔ افسانہ اس حقیر فقیر پر خیالات غالبہ کی صورت میں نازل نہیں ہوتا۔ واردات بن کر گذرتا ہے۔

باقر مہدی نے مجھے نئے افسانے کا تمغہ عطا نہیں کیا۔ ٹھیک کیا۔ میں اس اعزاز کا مستحق نہیں ہوں۔ میں تو قلیل تعداد نئے زمانوں میں بھٹک پھر رہا ہوں، دوسرے بزرگوں سے کہانی کا فن سیکھنے کی کوشش کر رہا ہوں جن کا تکنیک کی تاریخ میں کوئی ذکر نہیں ملتا۔ مجھے نئے افسانہ نگار سے مراد یہ ہے کہ نئے افسانہ نگار کے حصے میں کبھی کچھ نہیں آتی۔ میں ایسا نہ ہوتا تو میں افسانہ کیسے لکھتا۔ میں اردو والا نہ ہوتا تو ۳۶ والی لکیر کا فقیر بنا رہتا۔ اب بھی سنتے ہیں جو اسی لکیر کو پیٹے جا رہے ہیں حالانکہ سانپ نکل چکا ہے۔ مگر جو چھوٹی سی اذیت اس فقیر کے نصیب میں لکھی گئی ہے وہ تمہیں عطا نہیں ہوتی یعنی نہ میرا کوئی سر نہ پیر۔ پھر کاش کوئی اپنے پاستان کے انور سجاد کو بھی اس اذیت نے کچھ کام کا آدمی نہیں رہنے دیا ورنہ میں بھی افسانے کی نئی تکنیکیں سیکھ کر نیا افسانہ نگار بننے کی کوشش کرتا۔ میں اپنی حیثیت میں زمینوں اور زمانوں میں گھومتا پھرتا ہوں کتنے دنوں اجودھیا اور کربلا کے نشانے ہمارا پیچھا کر رہے ہیں جانے کے لیے۔ جب ایک آدمی اپنی بستی کو چھوڑتا ہے تو پورا ملک بستی ہے اور خود بستی پر کیا بیتتی ہے۔

اسی طرح ادارہ پیرنٹ ہیرا سے میں بہا تھا ہوں کہ جو ہوں میں نکلا اور شمشان گھاٹ بنا۔ یہ سوال بڑی دیر سے واردات ہے جب آدمی ان گنت زمانوں میں اور گنت فضاؤں میں زمانے سے بچھڑ کر وقت میں نشانہ بنتا ہے جیسے کوئی پرندہ خالی ذات۔ ان سے ٹکرا کر تمہارے نشانے اور شمشان گھاٹ کی جگہ کی سرحد آتی ہے۔ ان کی سرحدوں میں یہ کہہ رہے ہیں کہ فوج کی فصیل کے باہر اوں کا کس دیپ وہ اپنی کائنات سے نکال کر ستر زندہ رکھتے ہیں یہ بات ہے۔

جس میں کہ ایک جیتے ہوئے انسان ہے

الغرض اگر توفیق دے تو میں تمہارے شعور پر کرتی کے دکھی کے کرب کو پھیلا دوں گا۔

لیکن مجھے تو اپنی مصیبت پڑی ہوئی ہے میں جاتکوں کی کائنات میں حیران پھرتا ہوں اور سوچتا ہوں کہ کیا میرے ساتھ بھی یہ جنم جنم کا قصہ ہے۔ کس کس جنم میں کس کس بستی سے نکلا اور کہاں کہاں جا کر بسا۔ مگر میں تو اپنے پچھلے جنم بھول چکا ہوں۔ بس جہاں تہاں سے کوئی واقعہ کوئی بات یاد آجاتی ہے۔ میں نے ایک کہانی آخری آدمی لکھی یاروں نے لعن طعن کی کہ یہ ماضی پرست کس ماضی میں پہنچ گیا۔ پھر کہا کہ یہ اشرف المخلوقات کی تذلیل کی گئی ہے پھر کہا کہ اصل میں یہ علامتی کہانی ہے پھر کہا کہ آخری آدمی۔ یہ شخص خود ہے۔ یہ آخری بات میرے دل میں گھر کر گئی۔ واقعی آخری آدمی تو میں خود ہوں۔ یہ علامتی افسانہ نہیں۔ جاتک کہانی ہے۔ میری جنم کتھا۔ یہ اس زمانے کی بات ہے جب میں بنی اسرائیل میں پیدا ہوا تھا اور سبت کے دن مچھلیوں کا شکار کیا کرتا تھا۔ مگر مجھے کچھ کچھ یاد پڑتا ہے کہ میں نے سبت کے دن مچھلیوں کا شکار کرنے کے سوا اور اور جنم میں اور پاپ بھی کئے تھے سو مجھے سو جنم میں خوار ہونا پڑا۔ میں ان سب خواریوں کو یاد کرنا چاہتا ہوں۔ کیوں؟ اس لیے کہ میں اپنے آپ کو اکٹھا دیکھنا چاہتا ہوں۔ ان سب خواریوں کو اپنی سب مسخ شکلوں کو یکجا کر کے دیکھنا چاہتا ہوں کہ میں کل ملا کر کیا بنتا ہوں۔ کاش مجھے اگلے پچھلے سب اپنے زمانے یاد آجائیں اس طرح جیسے ہاتھی کے حافظہ میں اس کے پچھلے جنم منور ہوتے ہیں۔ پھر میں سیدھے سچے لفظوں میں کہانی لکھوں کہ جنم جنم پہلے کی بات ہے کہ بنارس نگری کے راج سنگھاسن پہ دیودت بٹھیارا راج کرتا تھا اور نرناری پشو پنچھی سب اس کے اپنائے کی چکی میں پستے تھے اور میں . . . . .

تو اگر باقر مہدی کو میری کہانی پر لیبل لگانے کا ایسا ہی شوق ہے تو وہ اسے جاتک کہانی کہہ سکتے ہیں۔ داستانوی کہانی کا نام میرے افسانوں کے سلسلہ میں کفایت کرتا نظر نہیں آتا۔

میری جاتک کہانی نئے افسانے کے ذیل میں آتی ہے یا نہیں آتی۔ پرانی کہانیوں کے ذیل میں جاتی ہے یا کس ذیل میں۔ یہ میں نے کبھی سوچا نہیں۔ ہاں ایک بات کہوں۔ مجھے بعض نئی لکھی ہوئی تحریریں بہت پرانی دھرانی نظر آتی ہیں۔ بعض بہت پرانی تحریریں نئی لگتی ہیں جب میں نے جاتک کہانیاں پڑھیں تو لگا کہ میں بالکل نئی طرز کا فکشن پڑھ رہا ہوں۔ لارنس نے انجیل کو ایک

زرد لیبہ ہ پیچیدہ عظیم ناول سمجھا تھا میں نے مہاتما بدھ کو نیا افسانہ نگار جانا جو اُس کافکا اور کامیو سے الگ مگر جیسے میں تیس برس پہلے کا نیا اردو افسانے پڑھتا ہوں تو لگتا ہے کہ میں کسی دنیا نوسی زمانے کا ادب پڑھ رہا ہوں۔

ہاں ایک اندیشہ ہے۔ میں جاتک کہانیاں لکھوں اور آپ کہیں کہ یہ شخص اپنے آپ کو دہرا رہا ہے حالانکہ یہ تو ہے ہی تکرار کا عمل۔ اور قرۃ العین حیدر تو مہاتما بدھ کی جاتکوں کے بارے میں بھی آسانی سے کہہ سکتی ہیں کہ بدھ نے اپنے آپ کو دہرایا بہت ہے۔ مجھے کلیات میر پڑھتے ہوئے دوسرے ہی دیوان میں لگا تھا کہ میر صاحب اپنے آپ کو دہرا رہے ہیں۔ پتہ نہیں مشرق والوں پر یہ کیا خدا کی مار ہے کہ اپنے آپ کو دہراتے بہت ہیں۔ ان لوگوں کے ادب میں ایسے ارتقائی مدارج نظر نہیں آتے جیسے مغربی ادب کی تاریخ میں نظر آتے ہیں۔ خیر یہ علمی بحث ہے جو میرے بس کی بات نہیں ہے واپس اپنی کھال میں آتا ہوں۔ جب میں کچھوے لکھ رہا تھا تو مجھے خواب احساس تھا کہ میں اس سے پہلے ایک کہانی زرد کتا لکھ چکا ہوں۔ تم پوچھو گے پھر یہ کہانی کیوں لکھی۔ پتہ نہیں۔ شاید یہ وجہ ہو کہ مجھے یہ شک پیدا ہو گیا تھا کہ یہ آدمی کی بنیاد میں خرابی کا معاملہ نہیں ہے بلکہ جس تہذیب کے سیاق و سباق میں یہ بات ہوئی ہے اس تہذیب کی تعمیر ہی میں خرابی کی کوئی صورت مضمر تھی کہ اس کے بطن سے زرد کتا پیدا ہو گیا۔ اس تشویش میں سوچا کہ چلو کسی دوسری تہذیب میں چل کر دیکھتے ہیں کہ وہاں کیا ہوتا ہے۔ تو میں پیچھے چلا اور یہ دیکھنا شروع کیا کہ جب میں بدھ دیو جی کے سنگھ میں تھا تو ان کی آنکھ بند ہونے کے بعد میں کیا کر رہا تھا۔ اگر خدا مجھے توفیق دے تو میں تہذیبوں میں لمبے سفر کروں اور دیکھوں کہ تہذیبیں بوریا سے قالین تک کا سفر کیسے طے کرتی ہیں کب کس موڑ پر زرد کتا نمودار ہوتا ہے اور کیسے بلندیوں میں اڑتے اڑتے ڈنڈی دانتوں سے سر کٹنے لگتی ہے۔

بات سے بات نکل کر کہاں نکل گئی۔ مبادا بالکل بہک جاؤں واپس آتا ہوں۔ ہاں تو میں کہہ یہ رہا تھا کہ میں جاتک کہانی لکھتا ہوں۔ یہ نئی ہے یا پرانی پتہ نہیں۔ اتنا پتہ ہے

کہ ۳۶ء کی حقیقت نگاری والی کہانی سے اس کا کوئی ناتا نہیں ہو سکتا کہ جاتک کہانی حقیقت کے اس محدود تصور کی نفی ہے جس پر مذکورہ حقیقت نگاری کی عمارت کھڑی ہے و نیز اس انسان دوستی کی جو مذکورہ افسانے کا طرۂ امتیاز سمجھی جاتی ہے۔ جاتک کہانیاں پڑھنے کے بعد ۳۶ء کی انسان دوستی مجھے فرقہ پرستی نظر آتی ہے۔ جاتکوں میں آدمی لوگ کوئی الگ فرقہ نہیں ہے۔ سب مخلوقات ایک برادری ہیں۔

تو اپنی جاتک کہانی کا حقیقت نگاری والے افسانے سے تو کوئی ناتا نہیں۔ علامتی اسلوب سے کیا رشتہ داری ہے۔ میں کیوں بتاؤں۔ تم خود بولو مگر باقر مہدی کہتے ہیں کہ میری کہانی سے نیا افسانہ خطرے میں پڑ گیا ہے۔ واقعی؟ میری کہانی نئے افسانے کے لیے چیلنج ہے پتہ نہیں میں تو یہ جانتا ہوں کہ میری کہانی بالآخر میرے ہی لیے چیلنج بن جاتی ہے۔

مگر اتنا کچھ کہہ چکنے کے بعد میں اور ہی کچھ سوچ رہا ہوں۔ بھائی میرے یہ نیا اور پرانا کیا ہوتا ہے۔ ماضی اور حال، گذرا ہوا زمانہ اور نیا زمانہ عہد قدیم اور عصر حاضر! یہ کیسی تفریق ہے۔ یوں وقت کا فلسفہ میں نہیں سمجھتا۔ مگر ایک پچھلے آدمی موریس نکل کی کتاب Time and LIVING میں (اس سے یہ نتیجہ مت نکال لینا کہ میں نے ایسی تفلسف و فلسفہ کی کتابوں کو بالاستیعاب پڑھا ہے) میں نے ایک بات پڑھی اور جی کو بہت لگی کہ یہ ساری تاریخ ایک جیتا جاگتا آج ہے۔ یہ ساری فکر انسانیت کے آج میں سانس لے رہی ہے۔ ہمارا یہ ننھا سا آج جسے ہم ترقی کی معراج جانتے ہیں خود آج کا ایک چھوٹا سا جز ہے یا اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ ہم مورکھوں نے اپنے مورکھ پن سے آج کو کل بنا دیا ہے۔ پورے آج میں سانس لینے کی ہمت جو نہیں رہی۔ بس اپنی بساط بھر چھوٹا سا آج اس میں سے تراش لیتے ہیں اور اس میں چھپ کر بیٹھ جاتے ہیں۔

اس پر مجھے یاد آیا کہ ۴۹-۴۸ کے سالوں میں جب میں اپنی چھوڑی ہوئی بستی کو یاد کر کے کہانیاں لکھ رہا تھا تو بزرگوں نے افسوس کیا کہ غریب ناسٹولجیا کا مارا ہوا ہے جیسے ناسٹولجیا کوئی مرض ہوتا

ہے۔ ہوتا ہوگا۔ مگر یاروں نے میرا جتنا علاج کیا اتنا ہی مرض بڑھتا گیا۔ اپنی بستی کے دنوں کو یاد کرتے کرتے میں ان دنوں کو یاد کرنے لگا جو میری پیدائش سے پہلے جگمگائے تھے اور جن کا ذکر میں نے اپنی نانی اماں سے سنا تھا۔ مرض اور بڑھا۔ ان دنوں کی یاد ستانے لگی کی نانی اماں نے دیکھے تھے۔ یہ سب دن میرے لئے گذرے ہوئے کل تھے مگر جانے کن چور رستوں سے میرے تصور میں داخل ہو رہے تھے۔ ہوتے ہوتے بہت سے ایسے کل جو مسلمانوں کے چودہ سو برسوں میں بکھرے ہوئے ہیں۔ میرے تصور میں سما گئے۔ پھر یوں ہوا کہ اس برصغیر کے ہزاروں برسوں میں سے مختلف کل میرے تصور میں رچنے لگے۔ اور بھی کل ہوں گے جو میرے اندر ہیں مگر مجھے ان کا شعور نہیں۔ سب دن اور سب زمانے ہمارے اندر ہیں۔ مگر ہم اپنی تنگ ظرفی سے انہیں مار کر ماضی بنا دیتے ہیں اور اپنے اندر دفن کر دیتے ہیں۔ ہمارا اندر ایک بڑا مدفن ہے جس میں جانے کتنے آج کل بن کر دبے پڑے ہیں۔ مجھ پر سنک سوار ہے کہ کہانی کا منتر پھونک کر سوئے ہوئے کلوں کو جگاؤں اور اپنے اس ننھے سے جاگتے آج میں سمو لوں۔ مگر پھر وہی بات کہ میں نہ ہانتھی ہوں کہ مجھے اپنے سارے کل یاد ہوں۔ نہ مہاتما بدھ ہوں کہ سارے گذرے کلوں کو سمیٹ کر ایک جگمگاتا آج بناؤں مگر چلو حسرت ہی سہی۔ اس حسرت کا حق تو مجھ سے مت چھینو۔

جب میں یوں سوچتا ہوں تو مجھے لگتا ہے کہ الف لیلہ، آگ کا دریا۔ اور کتھا سرت ساگر، تینوں میرے ہی زمانے کی کتابیں ہیں۔ سو جیسے میرے ہمعصر بلراج مینرا ویسے میرے ہمعصر سوم دیو جی۔ سو میرے بھائی یہ تو نہیں ہو سکتا کہ میں تمہاری خاطر اور تمہارے تنک سے آج کی خاطر سوم دیو جی کی ہمعصری سے انکار کر دوں۔ اگے تم سوچو۔

تمہارا اور سوم دیو جی کا ہمعصر انتظار حسین

○